تاریخ کا نیا موڑ

علی عبّاس جلالپوری

تاریخ کا نیا موڑ

علی عباس جلالپوری

تخلیقات: 6 بیگم روڈ، مزنگ، لاہور۔ فون: 042-37238014
takhleeqat@yahoo.com :ای میل www.takhleeqatbooks.com

نام کتاب : تاریخ کا نیا موڑ
ناشر : ''تخلیقات'' لاہور
اہتمام : لیاقت علی
سن اشاعت : 2013ء
ٹائٹل : سہیل احمد
پرنٹر : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
ضخامت : 174 صفحات
قیمت : -/260 روپے

تخلیقات: 6 بیگم روڈ، مزنگ، لاہور۔ فون: 042-37238014
www.takhleeqatbooks.com ای میل: takhleeqat@yahoo.com

ماموں جان

ہدایت علی خاں مرحوم

کی یاد میں

مشمولات

"بچے اندھیرے سے ڈریں تو کوئی تعجب نہیں،
لیکن بالغ لوگ روشنی سے ڈرنے لگیں تو
یہ حیرت کی بات ہوگی۔"

افلاطون

تاریخی تناظر

پتھر کے زمانے:

زمین کو سورج سے جدا ہوئے کئی ارب برس گذر چکے ہیں۔ شروع شروع میں یہ آگ کے ایک دہکتے ہوئے شعلے کی صورت میں سورج کے گرد چکر لگایا کرتی تھی۔ ان گنت صدیوں کے بعد اس آتشیں گولے کی بیرونی سطح ٹھنڈی ہو کر ٹھوس شکل میں بدل گئی اور اس پر ہوا اور پانی کی نمود ہوئی' عناصر کی ترکیب سے سمندروں کے پانی میں چپچپا مادہ حیات[1] ظاہر ہوا اور ننھے منے ذی حیات[2] نمودار ہونے لگے۔ زندگی کے آغاز اور اسفنجوں کے ظہور کے درمیان طویل زمانوں کا وقفہ ہے۔ اسی طرح مچھلیوں' پرندوں اور ریڑھ کی ہڈی والے حیوانات کے ارتقاء پر لاکھوں برس گذر گئے۔ دودھ پلانے والے حیوانات کے ایک گروہ میں لنگور' چمپانزی' گوریلا' بندر' اورنگ اوٹانگ اور انسان کے نیم حیوانی آباء شامل ہیں' جنہیں بندر مانس کہا جاتا ہے۔ بندر مانس اور لنگور وغیرہ میں فرق یہ تھا کہ بندر مانس دو ٹانگوں پہ چلتا تھا۔ اس نے پچھلی ٹانگوں پر چلنا دس لاکھ برس میں سیکھا تھا۔ اس کے ساتھ وہ درختوں پر بسیرا کرنے کی بجائے بھٹوں میں رہنے لگا۔ دو پیروں پر چلنے کے ساتھ اس کے ہاتھ کام کرنے کے لیے آزاد ہو گئے اور اس نے پتھروں اور لٹھوں کو اپنے بچاؤ اور شکار کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ جب اس نے گرے پڑے پتھروں کو رگڑ کر نکیلا کیا اور انہیں لٹھ کے ساتھ جوڑ کر برچھا بنایا تو گویا اپنا بازو لمبا کر لیا۔ اس نے پتھر کے بسولے' چھینیاں اور

---

1. Protoplasm :- Proto (پہلا) Plasm (شکل وصورت)

2. Protozoa :- Proto (پہلا) Zoon (حیوان) یہ نام لیون ہوک کا دیا ہوا ہے Amoeba اسی قسم کا ایک Cell کا حیوان ہے۔

چاقو بھی بنائے اور ان سے کام لینے لگا۔ اس طرح بقول انجلز کام اور محنت نے اسے حیوان سے انسان بنا دیا۔ شدہ شدہ محنت معاشرتی ترقی کا ایک فیصلہ کن عامل بن گئی۔ چنانچہ تاریخ عالم میں شروع سے معاشرے کی بنیادی تبدیلیاں محنت اور پیداوار سے ہی وابستہ رہی ہیں۔ دوسرے حیوانات نیچر کے رحم و کرم پر رہے اور آج بھی ہیں جبکہ انسان نے محنت کے طفیل نیچر پر بتدریج قابو پانا شروع کیا اور فطرتی ماحول کو حسب منشا بدلنے پر قدرت حاصل کی جس سے وہ حیوانات کی صف سے جدا ہو گیا اور ایک بالکل نئی مخلوق عالمِ وجود میں آئی۔ آج بھی دنیا بھر میں کم و بیش دس لاکھ قسم کے حیوانات بدستور نیچر کے غلام ہیں اور اپنی اپنی دنیا میں رہنے پر مجبور ہیں' جب کہ انسان کے آباء اوزار اور ہتھیار بنا کر نیچر کی ان زنجیروں کو بڑی حد تک توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ دوسرے حیوانات کے برعکس قدرتی اشیاء کی بجائے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی اشیاء کو استعمال کرتے اور قدرتی اشیاء کو بھی ذاتی ضروریات کے تحت استعمال میں لاتے مثلاً دوسرے حیوانات آگ سے ڈرتے تھے لیکن انسان کے آباء نے آگ سے اپنی کالی راتوں کو منور کیا اور اس سے اپنی حفاظت کا کام بھی لیا۔ اس نے آگ پر مٹی پکانے' گوشت بھوننے اور دھاتیں پگھلانے کے راز دریافت کیے اور لکڑیاں رگڑ کر اور پتھروں کو آپس میں ٹکرا کر خود آگ پیدا کرنے اور اسے محفوظ کرنے کے قابل ہو گیا۔[1]

ایک روسی عالم ایوان پاولوف نے ہمیں بتایا ہے کہ انسان نے پہلے پہل سوچنا کیسے شروع کیا۔ لینن گراڈ کے قریب موضع کولتوشی میں دو چمپانزی لائے گئے' جن کے نام رفائیل اور روزا تھے۔ انہیں الماری کی کنجیوں کا استعمال سکھایا گیا تھا اور وہ لکڑی کے بلاکوں کو جوڑ کر اور ان پر چڑھ کر چھت سے لٹکی ہوئی خوبانیوں کی ٹوکری بھی اتار لیتے تھے۔ ہوا یوں کہ چھت سے خوبانیوں کی ٹوکری لٹکا کر رفائیل کے قریب لکڑی کے ساتھ بلاک بے ترتیبی سے رکھ دیے گئے۔ خوبانیاں رفائیل کا من بھاتا کھاجا تھیں' وہ فرش پر بیٹھا للچائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ دیکھ کر دانت کٹکٹاتا رہا۔ پھر ٹوکری تک پہنچنے کے لیے الٹی سیدھی زقندیں لگائیں۔ تھک کر چور ہو گیا تو اپنی جگہ بیٹھ کر ستانے لگا لیکن اس کی نظریں برابر ٹوکری پر گڑی تھیں۔ وہ دیر تک بدھا کی حالت میں بیٹھا اپنا سر کھجاتا اور آنکھیں

1۔ انسان بڑا کیسے بنا۔ میخائل الیون

جھپکاتا رہا۔ آخر ایک خیال آتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے لکڑی کے بلاک ایک دوسرے پر جوڑ دیئے تاکہ ان پر چڑھ کر وہ خوبانیوں کی ٹوکری تک پہنچ سکے' اس نے بلاکوں کا منارہ بنایا لیکن چوک یہ ہوئی کہ چھوٹے بلاک نیچے رکھ دیئے اور بڑے والے اوپر چن دیئے' جب وہ اس منارے پر چڑھا تو بلاک لڑھک گئے اور وہ پٹخنی کھا کر دھڑام سے نیچے آ رہا۔ وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا اور حیرت اور تجسس سے بلاکوں کو تکنے لگا۔ اس نے پھر بلاک جوڑے۔ اب کہ سب سے بڑا بلاک نیچے رکھا لیکن اوپر کے بلاک بے ترتیب جوڑ دیئے' وہ لپک کر منارے پر چڑھا لیکن بلاک گر گئے۔ ان کے ساتھ رفائیل بھی چاروں شانے چت فرش پر پڑا تھا لیکن اس نے ہار نہیں مانی۔ بار بار کی ناکامی کے باوجود وہ بلاکوں کو جوڑ جوڑ کر ان کا منارہ بناتا رہا اور ٹوکری تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ آخر وہ بلاکوں کو ٹھیک ترتیب میں جوڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ منارے پر چڑھا اور ٹوکری اتار کر مزے مزے سے خوبانیاں کھانے لگا' جنہیں اس نے بڑی محنت سے حاصل کیا تھا۔ یہ سوچ' یہ کوشش کسی دوسرے حیوان کے بس کی نہیں ہے۔ قدیم پتھر کے زمانے میں رفائیل کے چچیرے بھائی بن مانس نے بھی اسی طرح کی بار بار ناکامیوں اور کوششوں سے اپنے عقدے سلجھائے تھے۔ معلوم ہوا انسان کی سوچ شروع ہی سے عقدوں کے شعور اور ان کے حل کی عملی تدبیروں سے وابستہ رہی ہے۔[1]

جرمنی کے دو عالموں کوفکا اور کوہلر نے لنگوروں پر تجربے کیے۔ لنگوروں کے پنجرے کے باہر کچھ پھل اور ان کے قریب ایک چھڑی رکھ دی گئی' لنگوروں نے پنجرے کی سلاخوں میں سے ہاتھ بڑھا بڑھا کر پھلوں کو اُچک لینا چاہا لیکن وہ ان کی دسترس سے باہر تھے۔ بار بار کی ناکامی کے بعد ایک لنگور نے چھڑی اٹھائی اور پھلوں کو اپنی جانب سرکا لیا اور انہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس سے کوفکا اور کوہلر نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ذہن انسانی کو کوئی عقدہ درپیش ہو تو وہ اسے سلجھانے کے لیے سوچتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اچانک شرر کی لپک کی مانند عقدے کا حل اس پر واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ نئے ماحول کے ساتھ باشعور طریقے سے موافقت پیدا کرنے اور خیالات کے مابین ربط و تعلق قائم کر

1۔ انسان بڑا کیسے بنا..... نفسیات تعلیم میں Gestalt کے نظریے کے بانی' ان کے خیال میں عقدے Insight سے حل کیے جاتے ہیں' جو دماغ کے مجموعی ردِ عمل سے پیدا ہوتی ہے۔

کے نئے نئے عقدے سلجھانے کا نام ذہانت ہے۔ بقول لینن ذہانت کی نشو ونما عمل سے ہوتی ہے اور وہ عمل کو اپنی جگہ بامقصد اور بامعنی بنا دیتی ہے۔ گفتگو بھی اظہار مطلب کے لیے اشاروں کنایوں کو بامعنی بنانے کی کوشش کا ہی نتیجہ تھی۔ جس سے فکرِ انسان کو بڑی تقویت نصیب ہوئی۔

ڈارون کہتا ہے کہ انسان کا ظہور پہلے پہلے افریقہ سے ہوا تھا۔ بعض علماء نے دعویٰ کیا کہ نیم حیوانی انسان جزائر شرق الہند میں نمودار ہوا تھا اور روس سے دوسرے ممالک کو گیا تھا۔ جاوا کی کھوپڑی کا بندر مانس آج سے پانچ لاکھ برس پہلے کا بتایا جاتا ہے' جبکہ پیکن کی کھوپڑی ڈھائی لاکھ سال کی پرانی ہے۔ جدید ترین تحقیقات کی رو سے قدیم ترین بندر مانس پنجاب کی سطح مرتفع پوٹھوہار کا باسی تھا۔ حال ہی میں اقوامِ متحدہ کے ایک ادارے یونیسکو کی طرف سے پوٹھوہار کے بارے میں نئے نئے انکشافات شائع کیے گئے ہیں۔ جن میں علمائے آثار قدیمہ کی تحقیق کے مطابق بندر مانس کا ارتقاء افریقہ یا جاوا میں نہیں بلکہ پوٹھوہار میں ہوا تھا۔ ژیل یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈ پل بیم نے پوٹھوہار سے اس بندر مانس کے اَسی آثار ڈھونڈ نکالے ہیں' جو کہ ایک کروڑ تیس لاکھ برس قبل مسیح کے ہیں۔ اس بندر مانس کا نام پنجابسکس رکھا گیا ہے۔[1]

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے محنت نے بندر مانس کو انسان بنایا تھا اور محنت ہی اس کی ذہنی وفکری نشو ونما کا باعث ہوئی تھی۔ جب یہی محنت اجتماعی صورت اختیار کر گئی' تو انسانی معاشرہ صورت پذیر ہوا۔ دوسرے حیوانات اور درندے اپنے اپنے لیے خوراک فراہم کرتے تھے جب کہ انسان کے آباء گروہ بنا کر شکار کھیلتے تھے اور اسے آپس میں بانٹ لیا کرتے تھے۔ ان کے باہم مل کر کام کرنے اور رہنے سہنے سے معاشرہ انسان کی ابتداء ہوئی جو نیچر سے الگ ایک مستقل صورت اختیار کر گیا۔ بے شک شہد کی مکھیاں' چیونٹیاں' بھیڑیں وغیرہ بھی مل جل کر رہتی ہیں لیکن وہ بدستور جبلتوں کی اسیر ہیں' جب کہ انسان کے ترقی یافتہ ذہن نے جبلتوں کے اس جبر کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ انسان نے معاشرے کی صورت میں مل جل کر رہنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس میں رہتے ہوئے وہ بامقصد اور بامسرت زندگی گذارنے کی کوشش بھی کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ ان تصریحات کا حاصل یہ ہے کہ

---

1. (Pakistan Times July 15, 1977)

محنت، بول چال اور معاشرتی زندگی نے بندر مانس کو انسان کا روپ دیا تھا۔

مسلکِ ارواح: 1

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح ناساعد قدرتی حالات کی کڑیاں جھیلنے اور عملی عقدوں کو سلجھانے کی کوشش میں قدیم انسان کے ذہن و دماغ نے ترقی کی تھی۔ عملی عقدوں کے ساتھ ساتھ اسے چند فکری الجھنوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جس سے اس کے تخیل میں وسعت پیدا ہوئی اور اسی تخیل کی مدد سے اس نے قوانینِ قدرت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پتھر کے زمانہ میں وہ چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ جہالت ہمیشہ دہشت کو جنم دیتی ہے' وہ کالی راتوں کے گھور اندھیارے' بجلی کی چمک' رعد کی کڑک' طوفانِ باد و باراں' زلزلے' درندوں' سانپوں' امراض اور موت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا...... جس سے اس کے دل و دماغ میں خوف اور بے چارگی کے احساسات جاگزیں ہو گئے۔ آج بھی ہم زلزلے کی دھمک' رعد کی کڑک اور موت سے دہشت محسوس کرتے ہیں۔

قدیم دور کے انسان کا ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ حقیقی اور خیالی دنیا میں فرق نہیں کر سکتا تھا اور خیالی دنیا کو ہی حقیقی خیال کرتا تھا۔ زندگی اور موت کے بارے میں سوچتے ہوئے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہوا کا جھونکا یا سانس ہی زندگی ہے۔ جب تک سانس کی ڈوری باقی ہے۔ وہ زندہ ہے اور اس ڈوری کے ٹوٹ جانے سے وہ لیٹ کر دم توڑ دیتا ہے۔ عربی میں نفس اور روح [2] کا معنی سانس لینا یا ہوا کا جھونکا ہے۔ یہ الفاظ اسی دور سے یادگار ہیں۔ ذہنی ارتقاء کے اس ابتدائی زمانے میں وہ اشیاء کو سمجھنے کے لیے انہیں اپنے آپ پر قیاس کرنے لگا اور جملہ اشیاء کو ذی روح اور ذی حیات قرار دیا۔ جس سے مسلکِ ارواح کی شروعات ہوئی۔ وقت گذرنے کے ساتھ روح کے اس تصور میں وسعت پیدا ہوئی' انسان کا روزمرہ کا مشاہدہ تھا کہ جب وہ راتوں کو اپنے غار میں سوتا تو حالتِ خواب میں دیکھتا کہ وہ کسی جنگل میں چل پھر رہا ہے۔ شکار کھیل رہا ہے یا اپنے مرے ہوئے عزیزوں سے باتیں کر رہا ہے۔ اس مشاہدہ سے اس نے دو نتائج اخذ کیے' ایک تو یہ کہ اس کے اندرون میں

---

1. Animism

2. عبرانی میں نفش اور رواح' سنسکرت میں آتما' یونانی میں Psyche' لاطینی میں Anima' انگریزی میں Spirit کا معنی ہے ہوا کا جھونکا۔

کوئی شئے ایسی بھی ہے' جو اس کا سایہ ہے...... بعد میں اُسے ہمزاد کہا گیا......اور جو سوتے میں گھومتا پھرتا ہے' دوسرا یہ کہ اس کے بزرگوں اور عزیزوں کے سائے موت کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں' چلتے پھرتے ہیں' کھاتے پیتے ہیں اور اس سے ملنے بھی آجاتے ہیں۔ لہٰذا اب اس نے روح کا تصور ہوا کے جھونکے یا سانس کی صورت میں کرنے کی بجائے اسے اپنی ہی صورت کی چلتی پھرتی کایا مان لیا جو ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی اور مرنے کے بعد کسی اور دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہتی ہے۔ یہی عقیدہ بعد میں مذہب کا سنگِ بنیاد بن گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مذاہب عالم میں خدا کی ہستی کے تصور' رسومِ عبادت اور عقائد و شعائر میں اختلافات ہوں تو ہوں اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ انسان موت کے ساتھ فنا نہیں ہوگا بلکہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھے گا۔ مذہب کی مقبولیت کا راز اسی میں ہے کہ وہ انسان کو موت کے بعد جی اٹھنے کی بشارت دیتا رہا ہے۔

اس دور کے انسان نے سعید یا نیک اور خبیث یا بدروحوں میں تفریق بھی کی۔ اس کے دوستوں اور عزیزوں کی روحیں سعید تھیں کیونکہ وہ ہر مشکل میں اس کے آڑے آتی تھیں' دشمنوں کی روحیں بد تھیں کہ اس میں حلول کر کے اسے امراض میں مبتلا کر دیتی تھیں' منگولوں' افریقی قبائل اور ملایا والوں کا شمن مت اس مسلکِ ارواح کی باقیات میں سے ہے۔ منگولوں کا شمن' سنسکرت کا سمن بہ معنی بزرگ ہمارے ہاں کا عامل اور جن گیر' افریقی حبشیوں کا جادوگر...... اپنے آپ پر وجد و حال کی کیفیت طاری کر کے سعید روحوں سے مدد مانگتا ہے اور بدروحوں کو نکالنے کے لیے افسوں پھونکتا ہے۔ ٹائلر اور فریزر نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ دیومالا' جادو' مذہب اور آرٹ پر مسلکِ ارواح کے گہرے اثرات ہوئے ہیں۔ قدیم انسان نے عظیم فطرتی مظاہر آسمان' سورج' چاند تاروں' سمندروں' دریاؤں وغیرہ سے روحیں منسوب کیں اور انہیں اپنی ہی طرح کی ہستیاں تسلیم کر لیا' جن کے ہاتھوں میں اس کے مقدر کی باگ ڈور تھی۔ وہ ان کی تالیفِ قلب کے لیے قربانیاں دینے لگا' نذرانے چڑھانے لگا' ان کے بت بنا کر ان کے آگے ماتھا ٹیکنے لگا اور ان کے لیے معبد تعمیر کرنے لگا' بعض مکار لوگ ان دیوتاؤں اور عوام کے مابین وچولے [1] بن گئے اور

[1] پنجابی کا لفظ ہے' جو آدمی فریقین کے درمیان معاملہ کرائے' اس کا مترادف اردو لفظ نہیں مل سکا۔

سادہ دل لوگوں کو یہ جھانسہ دے کر کہ وہ دیویوں یا دیوتاؤں سے حسب منشا اچھے یا بُرے کام لے سکتے ہیں۔ ان سے مال اینٹھنے لگے۔ بعد کے جادوگر، شمن، پروہت، پنڈت، پادری وغیرہ انھی کے جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ دیومالا قدیم انسان کی قوانینِ قدرت کو سمجھنے کی کوشش کی تھی، جب سائنس نے قوانینِ قدرت دریافت کر لیے تو دیومالا بھی غائب ہوگئی۔

طوطم مت نے بھی معاشرہ انسانی کی شکل پذیری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ قدیم زمانے کا انسان کسی نہ کسی جانور کو اپنا سرپرست بنا کر اسے مقدس سمجھتا تھا۔ جس سے قبائل کی شیرازہ بندی ہوئی لوگ اپنے ہی طوطم والے کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مقدس یا حرام...... حرام کا معنی پاک بھی ہے اور ناپاک بھی۔ یہ لفظ طبو کا صحیح ترجمہ ہے، کی تشریح کرتے ہوئے [1] رابرٹس سمتھ نے لکھا ہے کہ خاص خاص تقریبات پر قبیلے والے اپنے سرپرست جانور یا طوطم کو ذبح کر کے کھا جاتے تھے تاکہ اس کی پراسرار توانائی...... میلانیشیا والے اس توانائی کو مانا اور مراکو میں اسے برکہ (برکت) کہا جاتا ہے، جو بادشاہوں، ولیوں اور مجذوبوں میں ہوتی ہے...... ان میں بھی حلول کر جائے۔ عام حالات میں اس کا کھانا حرام یا طبو تھا۔ ایک طبو یہ بھی تھا کہ ایک ہی طوطم سے تعلق رکھنے والے مرد عورت آپس میں بیاہ نہیں کر سکتے تھے مثلاً ریچھ کے قبیلے والے کو شیر یا بھیڑیئے والوں کے قبیلے میں بیاہ کرنا پڑتا تھا۔

زرعی انقلاب:

پتھر کے تیسرے اور آخری [2] دور میں عورت نے فصلیں اگانے کا راز دریافت کیا۔ مرد شکار کھیلنے جنگل کو چلے جاتے تو عورتیں اناج کے پودوں کی بالیں اکٹھی کیا کرتی تھیں اور پرندوں کی دیکھا دیکھی ان کے دانے رغبت سے کھاتی تھیں، عورتوں نے دیکھا کہ جہاں کہیں اناج کے دانے گرتے ہیں، وہیں زمین سے اکھوے پھوٹنے لگتے ہیں اور ان پودوں کو بچا کر رکھا جائے تو ان کی بالیں دانوں سے بھر جاتی ہیں۔ انھیں ذخیرہ کرنے اور بافراط اگانے کے لیے عورتوں نے اپنے جھونپڑوں کے نواح میں زمین کھود کھود کر بیج بونا

---

[1] Religion of the Semites

[2] Neolithic Age

شروع کیا۔ اب شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کی بجائے لوگ دریاؤں کے کنارے کی زرخیز زمین پر فصلیں اگانے لگے' جن کی نگرانی کے لیے بستیاں بسائی گئیں' جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ شہروں کی صورت اختیار کر گئیں۔ اس طرح زرعی انقلاب کے ساتھ شہری زندگی یا تمدن کا آغاز دریائے سندھ' نیل اور دجلہ و فرات کے میدانوں سے ہوا اور ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدائی معاشرہ برابری کے اصول پر مبنی تھا' جسے لیوس مارگن [1] کی تحقیق کے مطابق قدیم اشتمالیت کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں ذرائع پیداوار پورے معاشرے کی ملکیت میں تھے اور پیداوار ہر شخص پر مساویانہ تقسیم کردی جاتی تھی۔ اس اجتماعی اور اشتمالی دور میں "میں" اور "میرا" کے الفاظ تک موجود نہیں تھے' جیسا کہ ہمارے زمانے کے وحشی قبائل کی زبانوں میں جن کا معاشرتی نظام اشتمالی ہے' یہ الفاظ نہیں ملتے۔ زرعی انقلاب کے استحکام کے ساتھ شخصی املاک کا تصور پیدا ہوا۔ ابتدا میں منقولہ املاک' ہتھیاروں' اوزاروں کو "میرا بسولا" "میرا کلہاڑا" کہا گیا۔ پھر غیر منقولہ املاک یعنی اراضی اور مکان کی ملکیت کے ساتھ شخصی املاک کا ادارہ رائج ہوگیا۔ عمرانی نقطۂ نظر سے ابتدائی زرعی معاشرہ کو مادری [2] کہا گیا ہے۔ اس نظام معاشرہ میں عورت کو مرد پر برتری حاصل تھی۔ بچے ماں کے نام سے پہچانے جاتے تھے اور اس کے وارث بھی ہوتے تھے۔ باپ کی حیثیت گھر میں ایک ضمنی خدمت گار کی ہوتی تھی اور ماں کنبے کے رشتوں اور وراثت کے معاملات میں مرکز و محور کا مقام رکھتی تھی۔ شوہر کو بچے کا باپ اس مفہوم میں نہیں سمجھا جاتا تھا' جیسا کہ ہمارے معاشرے میں سمجھا جاتا ہے۔ مرد عورت پر کسی نوع کا حق زوجیت نہیں رکھتا تھا۔ عورت اس کے ساتھ تخلیے میں جاتی تو مرد اس کا احسان مند ہوتا تھا اور گھر کا کام کاج کر کے اس کی خدمت کرتا تھا' جیسا کہ آج بھی بعض وحشی قبائل میں رواج ہے' جزائر ٹروبریانڈ کے باشندوں میں جن کا سماج مادری اصولوں پر مبنی ہے عورت کی سیادت مرد پر مسلّم ہے۔ بچے اپنی ماں کے پاس رہتے ہیں۔ بیوی شوہر کو اپنے میکے لے آتی ہے اور قبیلہ عورتوں' ان کے بچوں' نواسیوں اور نواسوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ [3] مالی نوسکی لکھتا ہے:

1. Ancientsociety
2. Matriarchal
3. Sex and Rerression in Savage Society

"ٹروبریانڈ کے وحشیوں میں مادری نظام معاشرہ پایا جاتا ہے۔ رشتہ ماں کی جانب سے پہچانا جاتا ہے اور وراثت بھی ماں ہی کی طرف سے پہنچتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لڑکا اور لڑکی ماں کے کنبے اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اپنے ماموں کو اپنا سرپرست مانتے ہیں' وہ میراث اپنے باپ سے نہیں بلکہ ماموں اور ممانی سے پاتے ہیں۔ شوہر کو بچوں کا باپ نہیں سمجھا جاتا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں دستور ہے۔ ان کے خیال میں بچے کا کوئی جسمانی رشتہ باپ سے نہیں ہوتا انہیں اس بات کی خبر نہیں کہ بچہ اپنے باپ کے صلب سے پیدا ہوتا ہے وہ کہتے ہیں' روحیں عورتوں کے رحم میں نفوذ کر کے انہیں حاملہ کر دیتی ہیں۔ شوہر کا اس عمل سے کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا۔ شوہر اپنی اولاد کا دوست اور بہی خواہ تو ضرور ہوتا ہے لیکن ان کا پیدا کرنے والا نہیں سمجھا جاتا۔ بچے اپنے ماموں کا حکم مانتے ہیں اور عورت کا رویہ بھی اپنے شوہر سے محکومانہ نہیں ہوتا۔ شوہر اپنی عورت کی خدمت کر کے ہی اس سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

مادری نظام معاشرہ میں دھرتی دیوی یا مہامیا کی پوجا بڑے ذوق شوق سے کی جاتی تھی۔ عورت بچے جنتی تھی اور دھرتی کی کوکھ سے فصلیں اگتی تھیں۔ اس لیے دھرتی کو ماں کہا جاتا تھا۔ اور وہ بھی عورت کی طرح بارآوری کی علامت بن گئی تھی۔ قدیم سمیریا کی نانا' بابلیوں کی عشتار' ایران کی اناہتا (ناہید)' ہند کی اُما' یونان کی افرودائتی' روم کی وینس وغیرہ دھرتی دیویاں تھیں۔

زرعی انقلاب کے اثرات انسانی معاشرے پر بڑے گہرے اور دور رس ہوئے۔

1- دریاؤں کے کنارے بستیاں بسانے کے ساتھ گوناگوں مسائل پیدا ہوئے' سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح ان بستیوں کو ان صحرائیوں اور کوہستانیوں سے بچایا جائے' جو بدستور خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جب بھی انہیں موقع ملتا' وہ بستیوں پر ٹوٹ پڑتے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیتے۔ بستیوں کے مکینوں نے اس کی ترکتاز کا مقابلہ کرنے کے لیے ہتھیار بند دستے بنائے' جن کی قیادت تنومند اور دلاور افراد کے سپرد کی گئی۔ یہ سردار جنگی تیاریوں میں معروف رہتے

تھے۔ اس لیے عام کاشتکاروں نے اپنی پیداوار کا کچھ حصہ ان کی وجہ معاش کے لیے وقف کر دیا تاکہ وہ یکسوئی سے دفاع کا کام سرانجام دے سکیں۔ یہی رسم بعد میں مالیہ اور خراج کی صورت اختیار کر گئی' جو آج بھی زرعی ممالک میں وصول کیا جاتا ہے۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ یہ سردار بادشاہ بن بیٹھے اور عوام کے ذہن و دماغ پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے دیوتاؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرنے لگے۔

-2 شہری ریاستوں کے ساتھ معاشی اور انتظامی ضروریات کے تحت معاشرہ انسانی طبقات میں ٹ گیا۔ اعلیٰ طبقہ بادشاہ اور اس کے درباریوں کا تھا' جن کے ہاتھوں میں فوجی طاقت، اور نظم و نسق کے امور کی باگ دوڑ تھی جو پیداوار کے سب سے بڑے ذریعے یعنی اراضی پر قابض تھے۔ دوسرا طبقہ تاجران اور چھوٹے مالکان اراضی پر مشتمل تھا' جو اجناس فراہم کرتے تھے۔ سب سے نچلا طبقہ غلاموں کا تھا جن سے کھیتوں میں مشقت لی جاتی تھی۔ شروع شروع میں جنگی قیدیوں کو جان سے مار دیتے تھے لیکن بعد میں انہیں غلام بنا کر ان سے بیگار لینے لگے۔

بادشاہ اور اس کے درباری غلاموں کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر داد عیش دیتے تھے' غلامی ریاستوں کی یہ تفریق تاریخ عالم کی ایک مستقل روایت بن گئی اسی تفریق سے طبقاتی آویزش کا آغاز ہوا۔ جو آج بھی کارخانہ دار اور مزدور میں باقی ہے۔

-3 مذہب کی تنظیم کی گئی اور پروہت دیوتاؤں اور عوام کے درمیان رابطے کا وسیلہ بن گئے ان کا تعلق مقتدر طبقے سے تھا۔ بادشاہ ریاست کا سب سے بڑا پروہت بن گیا اور پروہتوں نے اسے دیوتا کا درجہ دے دیا۔ پروہت عوام کو بادشاہ کی اطاعت کی ترغیب دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ خداوند کا نائب ہے' اس لیے اس کے احکام کی تعمیل کرنا عوام کا مذہبی فرض ہے' جو شخص بادشاہ سے بغاوت کرے گا وہ مردود اور عاصی ٹھہرے گا۔ اس کے عوض بادشاہ پروہتوں پر انعام و اکرام کرتے تھے۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ تخت اور معبد کا یہ ربط مستحکم ہو گیا اور عوام کی آزادی اور ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن گیا۔ پروہتوں نے دین فروشی کو باقاعدہ ایک کاروبار بنا لیا اور دیوتاؤں کے نام پر سادہ دل لوگوں سے نذرانے وصول کرنے

لگے۔ مزید برآں پروہتوں نے دھرتی دیویوں کے مندروں میں ''مقدس'' عصمت فروشی کا دھندا رائج کیا ان معبدوں میں سینکڑوں نوخیز دیوداسیاں رکھی جاتی تھیں' جو یاتریوں کے پاس خلوت میں جاتی تھیں ان کی خرچی پروہت وصول کرتے تھے۔ پروہت غربت کی چکی میں پسے ہوئے عوام کو تو اگلی دنیا میں سورگ دلانے کی بشارت دیتے تھے اور خود انہوں نے اسی دنیا میں بہشت بسا رکھا تھا۔ انہوں نے علوم پر بھی اپنی اجارہ داری قائم کر لی تا کہ ان کا ذہنی تسلط محکم ہو جائے اور دوسرے لوگ ان کی ابلہ فریبیوں سے بے خبر رہیں۔

4- اس طبقاتی معاشرے میں جبر و استحصال کی روایت قائم ہوئی۔ قدیم اشتمالیت کے دور میں پیداوار ہر شخص پر مساویانہ تقسیم کی جاتی تھی لیکن اب اس روایت کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ کھیت غلاموں کو کھانے پینے اور اوڑھنے کے لیے وہی کچھ دیا جاتا تھا جس سے ان کا رشتۂ جسم و جاں قائم رہ سکے۔

5- مقتدر طبقہ نے اپنے استبداد اور استحصال کو بحال رکھنے کے لیے ایسے قوانین بنائے جن سے شخصی املاک کا تحفظ مقصود تھا۔ ایک یونانی مفکر تھریسی میکس [1] کہتا ہے:

> ''طاقت وروں کے مفاد کا نام انصاف ہے۔ جب اسے اس بات کی تشریح کرنے کے لیے کہا گیا تو وہ بولا ''ملک پر طاقت ور لوگوں کا قبضہ ہوتا ہے جو قوانین نافذ کرتے ہیں۔ یہ قوانین قدرتاً ان کے ذاتی مفاد کے تحفظ کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں حالات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان قوانین کی پیروی کرنے والے عوام اپنے حکام کے مفادات کی پرورش کرتے ہیں۔''

اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لیوٹالسٹائے [2] لکھتا ہے:

> ''قانون کا مقصد عدل و انصاف کا قیام نہیں' طبقاتی مفاد کا تحفظ ہے برسرِ اقتدار طبقہ موجودہ صورتِ احوال کو اپنے مفاد کی خاطر جوں کا توں رکھنے کے لیے قانون سے آلۂ کار کا کام لیتا ہے۔ نظریاتی پہلو سے بے

---

1. Dialogues Plato
2. Resurrection

شک قانون کا مقصد عدل و انصاف کا قیام ہی ہوتا ہے لیکن عملاً ایسا نہیں ہے۔ قانون کا مقصد واحد یہ ہے کہ موجودہ صورتِ حال کو قائم و دائم رکھا جائے۔ اس لیے قانون ان لوگوں کا قلع قمع کر دیتا ہے جو عام سطح سے بلند تر ہو کر سوچتے ہیں اور موجودہ صورتِ احوال کو بدل دینے کی کوشش کرتے ہیں' انہیں سیاسی مجرم کہا جاتا ہے۔ قانون ان لوگوں کا استیصال بھی کر دیتا ہے جو عام سطح سے پست تر ہوتے ہیں اور جنہیں جرائم پیشہ کہا جاتا ہے۔"

عوام کو تو قانون کی پابندی کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا لیکن برسرِ اقتدار طبقہ اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھتا رہا اور اس نے اپنے اقتدار اور شخصی املاک کو بحال رکھنے کے لیے غیر قانونی ہتھکنڈوں سے بھی گریز نہیں کیا۔ ارسطو اور چانکیہ سے لے کر میکیاویلی تک مقتدر طبقے کے طفیل خوار دانشور حکام کو مشورہ دیتے رہے ہیں کہ ضرورت اور مصلحت کے تحت قانون کو بالائے طاق رکھ دینا انسب ہے۔ ارسطو حاکم کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کو بحال رکھنے کے لیے دشمنوں کے سر بے دریغ قلم کرا دے' انہیں آپس میں مل جل کر بیٹھنے' کھانا کھانے اور کھیلنے سے باز رکھے' بحث و مباحثہ کی مجالس سے گریز کرے' عورتوں سے جاسوسی کا کام لے' عوام میں جھگڑے اور تنازعے کھڑے کرتا رہے' رعایا کو مصروف رکھنے کے لیے جنگ چھیڑ دے تاکہ رعایا اس کی محتاج رہے۔ وہ کہتا ہے کہ ریاست کے قیام کا مقصد "مہذب لوگوں" کو پیدا کرنا ہے' جو علوم و فنون میں شغف رکھتے ہوں اور اونچے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ میکیاویلی اپنے شہزادے کو مشورہ دیتا ہے کہ خواہ وہ کتنا ہی بے دین اور ملحد ہو اسے عوام کو اپنے متدین ہونے کا یقین دلاتے رہنا چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ قوانینِ اخلاق اور آداب عام لوگوں کے لیے ہوتے ہیں۔ شہزادہ عام اخلاقی اصولوں کی پابندی کرے تو وہ اپنے اقتدار کو بحال نہیں رکھ سکتا۔ شاہ حمورابی والیِ بابل کے ضابطۂ اخلاق میں عدل و انصاف کے نام پر شخصی املاک کے ہی تحفظ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس میں بغاوت' چوری' ڈاکہ اور بدکاری کی سزا موت ہے کیونکہ ان سے شخصی املاک معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہیں۔ اہلِ تحقیق کے خیال میں یہودیوں کے احکامِ عشرہ شاہ حمورابی ہی کے ضابطے سے ماخوذ ہیں' کیونکہ ان میں

بھی شخصی املاک کا ہی تحفظ کیا گیا ہے۔

6- شخصی املاک نے انسان کے اخلاق پست کر دیئے اور تغلب و تصرف' لالچ' حسد' بغض اور عصب کے ذمائم کو ہوا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ املاک کی ہوس میں باپ نے بیٹے کا' بیٹے نے باپ کا' بھائی نے بھائی کا' شوہر نے بیوی کا' بیوی نے شوہر کا' ماں نے بچوں کا اور بچوں نے ماں کا بے دریغ خون بہایا۔ انسانی فطرت میں پدری اور مادری جبلتیں اساسی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے دامن میں ایثار' بے نفسی' مروت' احسان اور رحم و کرم کے مثبت اور تعمیری جذبات نے پرورش پائی تھی لیکن شخصی املاک کے جنون اور ہوسِ زر و مال نے انسانی فطرت کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ املاک کا لالچ ہی تاریخ میں خون ریزی' سفاکی اور قتل و غارت جیسے گھناؤنے جرائم کا سب سے بڑا سبب رہا ہے اور آج بھی یہی لالچ جرائم اور استحصال کا اولین محرک ہے۔

7- قدیم اشتمالیت کے دور میں عورت اپنے قبیلے کی سربراہ تھی۔ پدری معاشرے کی نمود زرعی انقلاب کے بعد ہوئی اور عورت بھی دوسری اشیاء کی طرح مرد کی شخصی املاک بن گئی اور اسے بھی گائے' بیل اور بھیڑ بکریوں کی طرح املاک میں شمار کرنے لگے۔ مرد نے آزادانہ ہوسناکی اور کام جوئی کا حق اپنے لیے مخصوص کر لیا لیکن عورت پر عصمت و عفت کی کڑی پابندی عائد کر دی۔ شادی کی رات کو عورت کی بکارت کا ثبوت نہ ملتا تو اسے جان سے مار دیتے تھے یا رسوا کر کے گھر سے نکال دیتے تھے' بعض ممالک میں ہر دلہن کو بیاہ کی رات بادشاہ یا رئیس علاقہ کے یہاں بسر کرنا پڑتی تھی اسے ''پہلی رات کا حق'' کہا جاتا تھا۔ پروہتوں نے عورتوں کو دیوداسیاں بنا کر ان سے مقدس عصمت فروشی کرائی تو کاروباری لوگوں اور بردہ فروشوں نے قحبہ خانے کھول کر عورت کو جنسِ بازاری بنا دیا۔

8- شخصی املاک اور ریاست کے قیام کے ساتھ جنگ و جدال کی بنیاد پڑ گئی۔ طاقتور سرداروں نے کمزوروں پر تاخت و تاراج کا آغاز کیا۔ دوسروں کی املاک کو غصب کرنے کے لیے خون کی ندیاں بہائی گئیں' نہتے اور بے گناہ شہریوں کو نہایت سفاکی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ تاریخِ عالم کے صفحات خونِ ناحق کے دھاروں

سے آلودہ ہیں اور جنگوں کے واقعات رقم کرتے وقت مؤرخین کے قلم سے خون ٹپکنے لگتا ہے۔ مقتدر طبقہ اپنے معاشی مفادات کے تحفظ اور شخصی املاک کو برقرار رکھنے یا اس میں اضافہ کرنے کے لیے سادہ لوح عوام کو جنگ کی آگ میں جھونک دیتا تھا۔

غلامی سماج میں پیداواری وسائل پر مقتدر افراد کا قبضہ تھا۔ اس لیے پیداواری علائق آقا اور غلام کی صورت میں نمایاں ہوئے۔ آقا' غلاموں اور لونڈیوں کی جان و مال کے مالک تھے۔ انہیں بر سرِ عام بھیڑ بکریوں کی طرح نیلام کر دیا جاتا تھا۔ بولی دیتے وقت گاہک غلاموں اور لونڈیوں کو ٹٹول ٹٹول کر پرکھتے تھے' امراء خوش وضع غلام اور خوش رو لونڈیاں ایک دوسرے کو تحفتاً بھیجا کرتے تھے۔ بردہ فروش افریقہ' یورپ اور ایشیا کے پسماندہ علاقوں پر دھاوے بول کر ہزاروں لونڈیاں اور غلام پکڑ لاتے تھے' جنہیں زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا تھا۔ نوخیز لڑکوں کو ہیجڑے بنا کر سلاطین و امراء کے ہاتھ بیچ دیا جاتا تھا' جو ان سے اپنی لونڈیوں کی نگرانی کا کام لیتے تھے یا اپنی غیر فطرتی ہوس کا نشانہ بناتے تھے۔ معمولی سی کوتاہی اور لغزش پر لونڈیوں اور غلاموں کو دردناک عذاب دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ روما کا ایک قانون تھا کہ اگر کوئی غلام اپنے آقا کو قتل کر دیتا تو قاتل کے ساتھ مقتول کے تمام غلاموں کی گردن مار دی جاتی تھی۔ سلاطین و امراء کے محلوں میں سینکڑوں خوبصورت لونڈیاں رکھی جاتی تھیں۔ بردہ فروش نوخیز لونڈیوں کو ناچ گانے کی تربیت دلا کر امراء کے یہاں گراں قیمتوں پر بیچتے تھے۔ جنگوں میں ہزاروں بچے' عورت اور مرد لونڈی اور غلام بنا لیے جاتے تھے' جن سے نہایت ذلت آمیز سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ غلام قدرتاً اپنے آقاؤں کے ظلم و ستم پر جی ہی جی میں کڑھتے رہتے تھے لیکن مجبوری کے عالم میں لہو کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے' جب کبھی کوئی حوصلہ مند غلام دوسرے غلاموں کو منظم کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ بغاوت کا علم بلند کر دیتے تھے۔ تاریخ عالم میں اس نوع کی کئی بغاوتوں کے آثار ملتے ہیں۔ ہم چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ جن سے آقاؤں اور غلاموں کی تاریخی آویزش کا ثبوت ملتا ہے۔

رومۃ الکبریٰ کی شہنشاہیت کی آخری صدی میں ایک غلام سپارٹاکس نے ہزاروں غلاموں کو منظم اور مسلح کر کے بغاوت کا پرچم بلند کیا اور کئی برس تک سرکاری فوجوں کو تابڑ توڑ

شکستیں دیتا رہا۔ آخر حکومت نے دغا اور فریب سے باغیوں پر قابو پا لیا۔ سپارٹاکس سمیت ہزاروں قیدی غلاموں کو سڑک کے دو رویہ سولیاں گاڑ کر ان پر لٹکا دیا گیا۔ جہاں انہوں نے سسک سسک کر جانیں دیں۔ سپارٹاکس کا شمار بجا طور پر تاریخ عالم کے عظیم قائدین میں ہوتا ہے اور وہ مجبوروں اور مظلوموں کی جرأت آفریں جدوجہد کی علامت بن گیا ہے۔ اس کی سوانح پر مبنی کئی غنائی تمثیلیں تصنیف کی گئی ہیں۔ ان میں ''بولشوئے کا پیش کردہ بیلے نہایت گراں قدر سمجھا جاتا ہے۔

دورِ عباسیہ میں کھیت غلاموں کو قِن کہا جاتا تھا' جنہیں اراضی کے ساتھ بیچ کر دیا جاتا تھا۔ ان کی حالت نہایت زار و زبوں تھی۔ خلیفہ معتمد عباسی کے دورِ حکومت میں زنگی (حبشی) غلاموں سے بصرہ کے نواح میں کلر شور کی کھدائی کر کے زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے کی مشقت لی جاتی تھی۔ انہیں کوڑے مار مار کر دن رات ان سے کام لیتے تھے۔ آخر زنگی غلاموں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے علی بن محمد کی سرکردگی میں بغاوت کا علم بلند کیا ہزاروں بھگوڑے غلاموں اور موالیوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ایک زبردست فوج بغداد سے بھیجی گئی لیکن غلام جانوں پر کھیل کر لڑے اور اسے شکست دے کر بھگا دیا۔ معتمد عباسی نے اپنے بھائی موفق کو ترک سردار موسیٰ بن بغا کے ساتھ ایک لشکرِ جرار دے کر بھیجا لیکن غلاموں نے انہیں عبرت ناک شکست دے کر تتر بتر کر دیا اور آگے بڑھ کر بصرہ کے علاوہ اہواز اور خوزستان کے کئی دوسرے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ علی بن محمد نے شہر مختار کو اپنا دارالحکومت بنایا اور مفتوحہ علاقوں کا بندوبست کر کے قابلِ کاشت اراضی کو غلاموں میں بانٹ دیا۔ غلام چودہ برس تک حکومت کی فوجوں کے ساتھ لڑتے رہے۔ آخر ایک جنگ میں علی بن محمد کام آیا اور اس بغاوت کو کچل دیا گیا۔ مورخین طبری اور مسعودی نے غلاموں کی اس بغاوت کے حالات شرح و بسط سے لکھے ہیں۔

آبادی میں اضافے کے ساتھ سیرِ حاصل قطعات اراضی زیرِ کاشت آ گئے جو سلاطین و امراء اور پروہتوں کی املاک میں تھے۔ کھیت غلام بے دلی سے کام کرتے تھے۔ اس لیے اراضی کو بٹائی پر ان کسانوں کو دینے کا رواج ہوا' جو اپنے ڈھور ڈنگر رکھتے تھے۔ اس طرح پیداواری قوتوں میں اضافے کے ساتھ جاگیرداری نظام کا قیام عمل میں آیا اور آقا اور غلام کی جگہ جاگیردار اور مزارعہ کا رشتہ ظہور پذیر ہوا۔ جاگیرداری نظام نے غلامی

نظام کی جگہ اس لیے لی تھی کہ وہ غلامی نظام پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد بھی صدیوں تک غلامی اور بردہ فروشی باقی رہی لیکن اب غلاموں سے کھیتوں کی بجائے اکثر و بیشتر گھروں اور کارگاہوں میں کام لینے لگے۔ روس اور اضلاع متحدہ امریکہ میں البتہ انیسویں صدی تک کھیتوں میں غلاموں سے کام لیتے رہے۔

جاگیرداری نظام میں مزارعوں اور ہاریوں کی حالت بعض پہلوؤں سے غلاموں سے بھی بدتر تھی۔ غلاموں کا نان نفقہ آقاؤں کے ذمہ تھا لیکن مزارعوں کو بسا اوقات قرض لے کر گذر اوقات کرنا پڑتی تھی۔ گویا وہ اپنی محنت گروی رکھ دیتے تھے۔ جو شخص قرض ادا نہ کر سکتا اس کے بیٹوں کو غلام بنا کر ان سے مشقت لے کر قرض وصول کیا جاتا تھا۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ پیداواری علائق کی بنیاد املاک کے رشتوں پر ہوتی ہے۔ جب پیداوار کے وسائل چند افراد کے ہاتھوں میں ہوں تو یہ علائق دشمنی اور عناد کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ چنانچہ آقاؤں اور غلاموں کی آویزش جاگیرداروں اور مزارعوں کی کشمکش میں بدل گئی اور کسانوں اور مزارعوں نے جابجا بغاوتیں کر کے انقلابی تحریکوں کی آبیاری کی' مثلاً چین کی تاریخ میں کسان اور ہاری شروع سے موثر کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ کسانوں کی پہلی بغاوت ''سرخ ابرو والوں'' کی تھی جو سن اٹھارہ بعد از مسیح میں شاہ وانگ سانگ کے عہدِ حکومت میں صوبہ شان تنگ میں برپا ہوئی۔ ہزاروں باغی کسانوں نے بغاوت کی علامت کے طور پر اپنے ابرو سرخ رنگ لیے اور شہروں میں گھس کر زمینداروں اور سرکاری اہل کاروں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ اس بغاوت کی آگ سات برس تک بھڑکتی رہی۔ 25 بعد از مسیح میں اسے دبا دیا گیا۔ اس کے بعد 84 بعد از مسیح میں ''زرد پگڑی'' والے کسانوں نے شورش برپا کی جو بیس برس تک جاری رہی اور جس کے باعث چین کی مملکت تین بادشاہتوں میں بٹ گئی۔ منگولوں (مغلوں) کی سلطنت کا خاتمہ ایک کسان رہنما چو یو آن چنگ کے ہاتھوں ہوا۔ جس نے ان کا تختہ الٹ کر اراضی کو نئے سرے سے کسانوں میں تقسیم کر دیا۔ چیئرمین ماؤزے تنگ کسانوں کی بغاوت کی روایت سے بے حد متاثر تھا اور لی کیوئی کا ذکر جس نے سونگ شاہوں کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا تھا' وہ اکثر کیا کرتا تھا۔ لی کیوئی کی زندگی کے حالات اور کارنامے ایک کتاب میں بیان کیے گئے تھے' جس کا ترجمہ پرل بک نے کیا تھا' جو لانگ مارچ کے دوران میں چیئرمین ماؤزے تنگ کے

مطالعے میں رہتی تھی۔ کسانوں کی بغاوتوں سے چیئرمین ماؤزے تنگ نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ پس ماندہ زرعی ممالک میں صنعتی مزدوروں کے تعاون کے بغیر بھی کسان انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔

انگلستان میں لیولرز نے کسان تحریک کا آغاز کیا۔ ان کے پاس کوئی اراضی نہیں تھی اور وہ فاقے کاٹنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ حکومت نے جاگیرداروں کے ایماء پر انہیں کچل دیا۔ جرمنی میں ہانس میولر نے 1524ء میں باغی کسانوں کی قیادت کی اور بغاوت کی آگ ملک میں چاروں طرف پھیل گئی۔ کسانوں نے سرکاری محصولات اور کلیسیا کے عشر ادا کرنے سے انکار کر دیا اور مسلح ہو کر سرکاری فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں ایک لاکھ تیس ہزار کسان کھیت رہے، پچاس ہزار نے بھاگ کر جنگلوں میں پناہ لی اور بے سروسامانی کے عالم میں لقمۂ اجل بن گئے۔ ہزاروں فاقہ زدہ بیوہ عورتیں اور یتیم بچے سڑکوں پر مارے مارے پھرتے رہے۔ اس دار و گیر کے زمانے میں مارٹن لوتھر نے جسے ایک عظیم مذہبی مصلح کہا جاتا ہے حکومتِ وقت اور جاگیرداروں کی حمایت کی اور کسانوں پر کفر و الحاد کے فتوے صادر کیے جس سے ریاست اور کلیسا کے اس تاریخی اتحاد کا علم ہوتا ہے جو ترقی پرور انقلابی قوتوں کو کچلنے کے لیے صدیوں سے قائم ہے۔ لوتھر نے ایک کتابچہ بھی لکھا جس کا عنوان تھا:

"کسانوں کے خونی غول کے خلاف"۔

روس میں سٹنکا رازن ایک کسان باغی تھا' جو امراء کو لوٹ کر ان کی دولت غریبوں میں بانٹ دیتا تھا۔ اس نے دریائے والگا کے کسانوں اور غلاموں کو اپنے ساتھ ملا لیا' اور گورنر کو قید کر کے اس کو استراخان کے برج سے نیچے پھینکوا دیا۔ رازن نے مال گزاری کے افسروں کو شکنجے میں کس کر عذاب دے دے کر مار دیا۔ آخر فوج نے اسے شکست دے کر پکڑ لیا اور سرِ عام سولی پر گاڑ دیا۔ عوام نے اس کی شجاعت اور فیاضی کی داستانیں نظم کیں۔ وہ انہیں ذوق و شوق سے گایا کرتے تھے اور سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ ایک نہ ایک دن دوسرا اسٹنکا رازن پیدا ہو گا' جو انہیں زار کے مظالم سے نجات دلائے گا یہ زمانہ لینن کے بچپن کا تھا وہ عوام کی باتیں سنتا تو جوشِ جذبات سے اس کے گال تمتمانے لگتے۔

فرانس کے کسانوں کے جذبات و احساسات کا اندازہ نپولین کی زندگی کے ایک

واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک دن نپولین اپنے جرنیل دوڈک کے ساتھ سیر کے لیے کھیتوں میں نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ایک کسان اپنے کھیت میں ہل چلا رہا ہے اور اس کا سیاڑ ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ نپولین نے اس سے کہا "دیکھو تمہارا سیاڑ ٹیڑھا ہے" کسان نے کہا "تم شہری بانکے مجھے سکھانے آئے ہو؟ ہتھی پر ہاتھ تو رکھ کر دیکھو۔" اس نے نپولین کو پہچانا نہیں تھا۔ نپولین نے آگے بڑھ کر ہتھی سنبھالی لیکن اس کا سیاڑ ایک گز بھی سیدھا نہ جا سکا اور ٹیڑھا میڑھا ہو کر رہ گیا۔ کسان نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا "چھوڑو میاں چھیلے یہ بات تمہارے بس کی نہیں' تمہارا کام تو رنگ برنگے کپڑے پہن کر ادھر ادھر اینڈتے پھرنا ہے۔ جاؤ چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

برصغیر میں تلنگانہ کی بغاوت ایک ولولہ انگیز انقلابی تحریک تھی۔ کسانوں نے جاگیرداروں کے خلاف بغاوت کر کے اراضی پر قبضہ کر لیا۔ نظام نے اپنی فوج اور پولیس کو شورش فرو کرنے کے لیے بھیجا تو کسانوں نے ہتھیار اٹھا لیے اور ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے وسیع علاقوں پر اپنا نظم ونسق سنبھال لیا۔ آخر انگریزوں کی مدد سے اس بغاوت کو کچل دیا گیا۔ ہزاروں کسان جیلوں میں ٹھونس دیے گئے اور ان کے رہنماؤں کو چن چن کر جان سے مار دیا گیا۔ تاریخِ عالم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پرور انقلابی تحریکوں کو وقتی طور پر تو دبایا جا سکتا ہے لیکن ان کا استیصال کسی کے بس کی بات نہیں۔ کسانوں کی بغاوتوں کے اثرات عوام کے ذہن وقلب میں اس درجے راسخ ہو چکے ہیں کہ آج بھی دنیا بھر کے کسان ان سے ذوقی وانقلابی فیضان حاصل کر رہے ہیں۔

جاگیرداری نظام میں جاگیرداروں اور کھیت غلاموں کے تضاد کے دوش بدوش ایک تضاد سلاطین اور جاگیرداروں کے درمیان بھی موجود تھا۔ جاگیردار سلاطین کے خلاف بغاوتیں کرتے رہتے تھے۔ انگلستان میں جاگیرداروں نے شاہ جان کو مجبور کر کے اس سے "بڑے کاغذ" پر دستخط کروائے تھے' جو بعد میں انگریزوں کی جمہوریت کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل بن گیا۔ وسطی زمانوں میں بڑے پادری بھی جاگیرداروں کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔ کلیسیا اور راہب خانوں کے ساتھ سیر حاصل اراضی وقف کر دی گئی' جس کی برداشت سے پادری فیض یاب ہوتے تھے۔ یہ مقدس آباء بھی جو عمر بھر مجرد رہنے کا حلف اٹھاتے تھے' غریب مزارعوں کی بہو بیٹیوں کو بیاہ کی رات اپنے یہاں بسر کرنے پر مجبور کیا کرتے تھے۔

احیاء العلوم کی صدیوں میں جب گولہ بارود کی ایجاد کا رواج ہوا تو بادشاہوں نے ابھرتے ہوئے تاجر طبقے کو اپنے ساتھ ملا لیا اور جاگیرداروں کے سربفلک قلعے مسمار کرا دیئے اور وہ مٹ مٹا کر تاریخ کے ملبے میں غائب ہو گئے۔

صنعتی انقلاب:

سائنس کی ایجادات کے ساتھ پیداواری قوتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا اور صنعتی انقلاب کے لیے راہ ہموار ہو گئی جو زرعی انقلاب کے بعد تاریخ کا دوسرا بڑا سنگ میل ہے' جس نے معاشرہ انسانی پر انمٹ اثرات ثبت کیے ہیں۔ ان اثرات کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہمیں سائنس کی ترقی کا ذکر کرنا ہوگا جو صنعتی انقلاب کے آغاز اور فروغ کا باعث ہوئی تھی۔ رومہ کے زوال کے بعد ایک ہزار برسوں تک مغرب کے افق پر جہالت کی تاریکیاں چھائی رہیں۔ اس دوران میں چین اور دنیائے اسلام میں علم کی شمع جگمگاتی رہی' جس کی تابناک شعاعیں' ہسپانیہ' شام اور صقلیہ کے راستے مغرب کو منتقل ہو گئیں۔ پیڈوا اور پیرس کی درسگاہوں میں ابن رشد کا فلسفہ پڑھایا جاتا تھا۔ ابن رشدیت دوگونہ صداقت کا مبلغ تھا۔ مذہب کی صداقت اور فلسفہ کی صداقت۔ وہ کہتا تھا کہ اہل مذہب کو فلسفیانہ افکار میں دخل نہیں دینا چاہیے اور فلاسفر کو مذہبی عقائد پر رائے زنی سے گریز کرنا چاہیے۔ ابن رشدیت کی اشاعت سے مغربی ممالک میں فلسفے کو مذہب سے جدا کر دیا گیا' جس سے حریت فکر کو تقویت ہوئی اور وہ پھپھوندی دور ہو گئی جو صدیوں سے کلیسیا کے ذہنی استبداد کے باعث لوگوں کے ذہن و قلب پر جم گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اہل مشرق مذہبی جنون اور تقلید بے جا کی گرفت میں آ چکے تھے۔ مشرقی ممالک میں اہلِ تحقیق پر کفر و زندقہ کے فتوے صادر کر کے ان کا استیصال کیا گیا اور ابن رشد کی فلسفہ کی کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ ادھر مغرب میں نشاۃ ثانیہ (نئی پیدائش) برپا ہوئی' علوم و فنون کلیسیا کے آہنی پنجوں سے آزاد ہو گئے اور اہل مغرب علمی تحقیق کے ولولے سے سرشار ہو گئے۔ گلیلیو' کوپرنیکس' نیوٹن اور کاپلر نے ہیئت اور طبیعات کے علوم میں حیرت انگیز انکشافات کیے۔ کولمبس' میگی لان' واسکوڈے گاما اور والٹر ریلے نے بحری سفر کر کے نئی دنیا دریافت کی اور ایشیا کے دور دراز ممالک تک پہنچنے کے نئے نئے راستے معلوم کیے۔ سائنس کے انکشافات کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ انگلستان میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا۔ 1730ء میں آرک رائٹ نے سوت کاتنے

کی کل ایجاد کی جو آبی قوت سے چلتی تھی۔ 1782ء میں جیمز واٹ نے دخانی انجن ایجاد کیا۔ 1829ء میں لورپول اور مانچسٹر کے درمیان ریل کی پٹڑی بچھا دی گئی۔ 1838ء میں پہلے دخانی جہاز گریٹ ایسٹرن نے بحرِ اوقیانوس کو عبور کیا۔ 1842ء میں سیموئیل مورس نے تار برقی ایجاد کی۔ 1800ء اور 1850ء کے درمیانی برسوں میں صنعتی انقلاب یورپ اور امریکہ میں پھیلتا ہوا جاپان تک پہنچ گیا۔ انگلستان میں سوتی کپڑا بننے اور فولاد ڈھالنے کے بڑے بڑے کارخانے قائم کیے گئے اور مصنوعات کی کھپت کے لیے ایشیاء اور افریقہ کے ممالک کو منڈیوں میں بدل دیا گیا۔ نوآبادیوں سے سستے داموں کچا مال درآمد کیا جاتا تھا۔ اور اسے مصنوعات کی صورت میں دوبارہ انہی ملکوں میں مہنگے داموں بیچا جاتا تھا۔ صنعت کاری اور تجارت کی وسعت کے ساتھ اہلِ مغرب کے پاس وافر سرمائے کے ذخائر جمع ہو گئے۔ جنھیں مزید صنائع میں لگایا گیا۔ شہروں میں ہر کہیں کارخانے قائم کر دیے گئے اور دیہاتیوں نے حصولِ روزگار کے لیے شہروں کا رخ کیا۔ 19ویں صدی کے اواخر میں دوسری مغربی اقوام نے ایشیاء اور افریقہ کے بچے کھچے ممالک پر قبضہ کر لیا اور جنوبی امریکہ سے لے کر راس امید تک اور مشرقِ وسطیٰ سے لے کر ہند تک اہلِ مغرب کا اقتصادی اور سیاسی تسلط قائم ہو گیا۔ صنعتی اور تجارتی رقابت نے سیاسی چشمک کو ہوا دی اور مالی مفادات کے تحفظ کے لیے دو عالمی جنگیں لڑی گئیں۔ ایشیا' جنوبی امریکہ اور افریقہ کے استحصال کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ سامراجیوں کے جبر و استحصال کی مثال جنگِ افیون (1839ء-1842ء) سے دی جا سکتی ہے جب انگریزوں نے بزورِ شمشیر چینیوں کو افیون خریدنے اور کھانے پر مجبور کیا تھا۔

کلیسیائی نظام' قانون اور تنظیمِ مملکت کی طرح سامراج کی روایت بھی اہلِ مغرب کو قدیم رومہ سے ورثے میں ملی ہے۔ رومہ نے افریقہ کی ابھرتی ہوئی طاقت کارتھیج کو پے در پے حملے کر کے تباہ کر دیا تھا تاکہ وہ بحیرہ روم کے ساحلی ممالک کا بلاشرکتِ غیرے استحصال کر سکیں۔ مغرب کے سامراجیوں نے مذہب کو اپنے تجارتی مفادات کے تحفظ کے لیے آلۂ کار بنا لیا۔ تبلیغ عیسائیت کے نام پر ہزاروں مشنری مفتوحہ ممالک کو بھیجے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ عیسائیت کو قبول کر کے دیسی باشندے سامراجی آقاؤں کو اپنا ہم مذہب سمجھنے لگیں اور ان کی معاشی لوٹ کھسوٹ سے صرفِ نظر کر لیں۔ جنوبی افریقہ کے ایک سردارِ قبیلہ نے کہا تھا:

"جب سفید آدمی آیا تو اس کے پاس بائبل تھی اور ہمارے پاس
اراضی۔ اب اس کے پاس اراضی ہے اور ہمارے پاس بائبل ہے۔"

جن دیسیوں نے مزاحمت کی' ان کو بے دردی سے تہ تیغ کر دیا گیا۔ اضلاع متحدہ امریکہ میں لال ہندیوں کا اس بری طرح قتلِ عام کیا گیا کہ سینکڑوں قبیلے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ امریکی کہا کرتے تھے:

"صرف ایک مردہ لال ہندی ہی اچھا لال ہندی ہوتا ہے۔"

بچے کھچے قبائل کو چند مخصوص علاقوں میں محصور کر دیا گیا' جیسا کہ آج کل جنوب مغربی افریقہ کے لاکھوں دیسیوں کو باڑوں میں بند کر کے انہیں ابتدائی شہری اور انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اضلاع متحدہ امریکہ کی جنوبی ریاستوں کو حبشی غلاموں نے خون پسینہ ایک کر کے قابلِ کاشت بنایا تھا لیکن امریکی ان کی اولاد کو جانوروں سے بدتر سمجھتے رہے اور معمولی شک و شبہ کی بناء پر فرضی جرائم میں ملوث کر کے انہیں آگ کے الاؤ میں جھونکتے رہے ہیں۔ کانگو میں شاہ لیو پولڈ دوم نے جو ایک راسخ العقیدہ عیسائی اور "انسان دوست" سمجھا جاتا تھا حبشیوں کا اس بے دردی سے قتلِ عام کروایا کہ کانگو کے دیسیوں کی آبادی پندرہ برسوں میں دو کروڑ سے گھٹ کر نوے لاکھ رہ گئی۔ جنوبی امریکہ میں ہسپانوی لٹیروں کارٹیز اور پزارو نے لاکھوں دیسیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے بیٹے بیٹیوں کو لونڈی' غلام بنا لیا گیا۔ سامراجیوں اور سرمایہ داروں نے خود اپنے ہم وطنوں کو بھی اپنی بے پناہ ہوس کا نشانہ بنانے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ انگلستان کی کوئلے کی کانوں میں مردوں' عورتوں اور بچوں سے دن رات میں بیس بیس گھنٹے کام لیا جاتا تھا' جس سے ہزاروں مزدور تپ دق اور یرقان کے امراض میں مبتلا ہو کر لقمۂ اجل بن گئے' جیسا کہ مارکس اور انجلز نے لکھا ہے عورتوں کی گردنوں کو رسیوں کے جواء میں جکڑ کر ان سے لوہے اور کوئلے کی لدی ہوئی کشتیوں کو دریا کے کنارے کھینچنے کا کام لیا جاتا تھا۔ ولبر فورس جیسے انگریز مصلح اور انسان دوست غلامی کے انسداد کے لیے شور مچا رہے تھے لیکن انہوں نے اپنے ہی ہم وطنوں' آزاد شہریوں' عورتوں اور بچوں کی حالتِ زار کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ جو کانوں میں کام کرتے تھے۔ وجہ ظاہر ہے اس سے سرمایہ داروں کی آمدنی اور منافع میں کمی واقع ہونے کا خدشہ تھا۔ برٹرنڈ رسل نے اس بات کو ایک نفسیاتی عجوبہ کہا ہے کہ ایک

طرف تو انگریز دانشور غلامی کے انسداد میں کوشاں تھے اور دوسری طرف اپنے کارخانوں اور کانوں میں مزدوروں پر ظلم وستم توڑ رہے تھے۔ ہمارے خیال میں یہ کوئی نفسیاتی عجوبہ نہیں ہے بلکہ ایک عام فہم حقیقت ہے۔ سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا' کوئی ضابطہ اخلاق نہیں ہوتا' کوئی وطن نہیں ہوتا' کوئی قوم نہیں ہوتی۔ ان کی اپنی ایک الگ قوم ہے جو دنیا بھر کے استحصال کرنے والوں اور منافع خوروں پر مشتمل ہے۔ اپنے مشترکہ مفاد کے تحفظ اور اپنے استحصال کو بحال رکھنے کے لیے وہ ان غیر ملکی سرمایہ داروں سے بھی اتحاد کر لیتے ہیں' جن سے ان کی قوم کی سیاسی دشمنی ہوتی ہے۔ وہ محض عوام کو چکر دینے کے لیے مذہب' اخلاق' انسانی دوستی' رفاہِ عامہ یا آزادی رائے کی بات کرتے ہیں اور اپنے معاشی استحصال کو باقی و برقرار رکھنے کے لیے ہر قسم کے گھٹیا حربے استعمال کرنے سے نہیں چوکتے۔

صنعتی انقلاب کے نتائج مختصراً درج ذیل ہیں:

1- کارخانوں میں لاکھوں مرد عورتیں مل کر کام کرنے لگے' جس سے پیداوار اشترا کی صورت اختیار کر گئی۔ اس کا قدرتی نتیجہ مشترکہ املاک کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیے تھا لیکن سرمایہ داروں اور صنعت کاروں نے ذاتی مفاد کی خاطر شخصی املاک کے فرسودہ نظام کو قائم رکھا' جس سے پیداواری قوتوں کو پوری طرح پنپنے کا موقع نہ مل سکا اور ذاتی نفع اندوزی کے لیے معاشرے کی اجتماعی ضرورتوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ایک طرف سرمایہ دار دولت کے انبار سمیٹتے رہے' دوسری طرف محنت کشوں کی زبوں حالی' افلاس اور بے روزگاری میں اضافہ ہوتا گیا۔ جن ممالک میں اشترا کی نظام قائم کر دیا گیا۔ وہاں املاک شخصی نہیں رہی بلکہ مشترکہ صورت میں بدل گئی ہے جس سے استحصال کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ طبقاتی آویزش کے ازالے اور پیداواری رشتوں میں مفاہمت ہو جانے کے باعث پیداواری قوتوں کی نشوونما میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی اور شخصی اور اجتماعی مفادات میں مطابقت پیدا ہو گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں ان ممالک میں افلاس و احتیاج' مہنگائی' افراطِ زر اور بے روزگاری ختم ہو گئی ہے۔

2- سرمایہ داری نظام میں نئے پیداواری رشتوں یعنی کارخانہ دار اور مزدوروں میں وہی دشمنی موجود ہے جو زرعی معاشرے میں جاگیرداروں اور مزارعوں کے درمیان پائی

جاتی ہے۔ چنانچہ طبقاتی آویزش میں شدت آ گئی ہے اور سرمایہ دارانہ معاشرے میں انتشار و خلفشار بڑھ گیا ہے۔ سرمایہ دار آج بھی جدید صنعتی معاشرے میں زرعی معاشرے کی پرانی اور فرسودہ استحصالی قدریں باقی و بحال رکھنے پر بضد ہیں۔ جن سے ان کا معاشرہ تضادات کا شکار ہو کر تنزل پذیر ہو گیا ہے۔

3- سامراج سرمایہ داری ہی کے شجرِ خبیث کا زہریلا پھل ہے' مغرب کے اجارہ داروں نے ایشیا' افریقہ اور جنوبی امریکہ کی پسماندہ اقوام کو قرضوں میں جکڑ رکھا ہے اور ان پر اپنا ''طرزِ حیات'' ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی اس سنگ دلانہ خود غرضی سے امنِ عالم سخت خطرے میں پڑ گیا ہے۔

4- صنعتی انقلاب کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ عورت صدیوں کی غلامی سے آزاد ہوتی جا رہی ہے اور مرد کی وہ برتری اور سیادت ختم ہو گئی ہے جو اسے زرعی معاشرے میں حاصل تھی۔ اشتراکی معاشرے میں عورت سچی آزادی سے بہرہ یاب ہو گئی ہے اور مرد کے دوش بدوش تحقیقی اور تخلیقی کارنامے سرانجام دے رہی ہے۔

5- سائنس نے صنعتی انقلاب کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ صنعتی انقلاب سائنس کی بیش از بیش ترقی و ترویج کا باعث ہوا ہے۔ کارل مارکس کا قول ہے کہ سائنس بنی نوع انسان کی نجات دہندہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سائنس نے جدید دور کے انسانوں کو ان توہمات و خرافات سے نجات دلائی ہے جو صبحِ تاریخ سے ذہنِ انسانی کو پراگندہ اور دہشت زدہ کرتے رہے ہیں۔ اب انسان نے باطنیت اور رومانیت کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور وہ حقیقت پسندانہ انداز میں عقل و خرد کے وسیلے سے اپنے معاشی' سیاسی اور عمرانی عقدے حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اشتراکی معاشرے کے افراد اپنی ذاتی نجات اور شخصی فلاح کے لیے کام نہیں کرتے بلکہ اجتماعی بہبود کے حصول میں کوشاں ہیں۔

6- جدید طبیعیات کے انکشافات نے زرعی دور کی ازلی و ابدی صداقتوں کے بجائے جو قدیم مذاہب سے وابستہ ہیں۔ اضافی صداقتوں کا تصور پیش کیا ہے' جس سے مذہبیت کو ضعف پہنچا ہے۔ البتہ مغرب کے اجارہ دار اور ساہو کار مذہب کو بدستور اپنے مالی مفادات کی پرورش کے لیے بطور آلۂ کار استعمال کر رہے ہیں اور اس

کوشش میں ان کے طفیل خوار پروہت اور پادری ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

7- زرعی معاشرے کا اخلاق شخصی املاک کے تصور سے وابستہ تھا جس کے دامن میں لالچ، حسد اور خود غرضی کے تخریبی جذبات پرورش پاتے رہے ہیں۔ یہ صورت حال سرمایہ دارانہ ممالک میں آج بھی برقرار ہے کیوں کہ وہاں شخصی املاک کا تقدس باقی ہے۔ اشتراکی ممالک میں جہاں شخصی املاک کو ختم کر کے مشترکہ املاک کو نظام معاشرہ کی بنیاد بنا دیا گیا ہے، وہاں کی اخلاقی قدریں بھی اجتماعیت سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ اس معاشرے کے افراد ذاتی مفاد کے حصول میں کوشاں نہیں ہوتے بلکہ عوامی بہبود کے کام کرتے ہیں۔ اخلاقیات کی اصطلاح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ استحصالی اور طبقاتی معاشرہ انانیت[1] پر مبنی ہوتا ہے۔ جب کہ اشتراکی معاشرے میں عمومی فلاح[2] کے آدرش کی عملی ترجمانی کی جا رہی ہے یعنی اخلاقی قدروں کی اساس شخصی املاک یا انانیت نہیں رہی بلکہ مشترکہ املاک اور عمومی فلاح ان کا سنگِ بنیاد بن گئی ہے۔

زرعی معاشرے میں غلاموں، مزدوروں اور کھیت مزدوروں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی صنعتی انقلاب کے بعد اس جدوجہد کی قیادت مزدوروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ پرولتاریہ (لغوی معنی ہیں بہت سی اولاد رکھنے والے یعنی غریب) کی خوش قسمتی سے انہیں کارل مارکس، انجلز، لینن اور ماؤزے تنگ جیسے عظیم قائد ملے جو بیک وقت مفکر بھی تھے اور مردانِ عمل بھی تھے۔ کارل مارکس اور انجلز نے 1848ء میں اپنا انقلابی منشور پیش کیا اور دنیا بھر کے محنت کشوں کو متحد ہو کر سرمایہ داروں کے خلاف جدوجہد کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ مزدور کارخانے میں جو قدرِ زائد پیدا کرتا ہے، وہی جمع ہو کر سرمایہ داروں کی دولت بن جاتی ہے انہوں نے محنت کشوں کو بتایا کہ کس طرح عملی کشمکش سے اس ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ لینن اور ماؤزے تنگ نے کارل مارکس اور انجلز کی دکھائی ہوئی راہوں پر چل کر محنت کشوں کی رہنمائی کی اور چین اور روس میں اشتراکی انقلاب برپا کیے، جس سے تاریخِ عالم میں ایک نئے اور درخشاں دور کا آغاز ہوا۔

---

1. Egoism

2. Altruism

فکری تناظر

اشتمالیت کی روایت:

انسان شروع سے ایک ایسے معاشرے کا آرزومند رہا ہے' جس میں اس کی ضروریات احسن طریقے سے پوری ہوں' عورت اور مرد کو یکساں حقوق حاصل ہوں' امیر غریب کی تفریق نہ ہو' بچوں کی تعلیم و تربیت اور طبی امداد کے ایک جیسے مواقع میسر ہوں۔ ہر شخص کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے پنپنے کے وسائل موجود ہوں۔ قانون کی نظر میں حاکم و محکوم کا کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے تاکہ وہ سکون اور مسرت کی زندگی گذار سکے۔ جیسا کہ ہم پہلے باب میں دیکھ چکے ہیں۔ قدیم اشتمالی معاشرے میں خوراک' لباس اور ٹھکانے میں افراد قبیلہ برابر کے شریک تھے۔ شخصی املاک کا کوئی وجود نہ تھا' املاک مشترکہ تھی اور پورے معاشرے کی تحویل میں تھی۔ زرعی انقلاب کے نفوذ کے ساتھ شخصی املاک کا آغاز ہوا' جس نے وحدت نوع انسانی کو پارہ پارہ کر دیا۔ آقا اور غلام' جاگیردار اور کھیت مزدور کے طبقات صورت پذیر ہوئے۔ حصولِ املاک کے جنون نے ظلم و ستم' جبر و استبداد' لوٹ کھسوٹ' قتل و غارت' تصرف و تغلب' لالچ اور حسد کے تخریبی جذبات کو اکسایا اور کمزوروں اور محنت کشوں کے لیے یہ دنیا دوزخ کا نقشہ بن گئی۔ مذہبیت کے نام پر عوام کو اس دنیا میں اپنے انسانی حقوق کی جدوجہد سے باز رکھا گیا اور اہل فکر و نظر عالم تخیل میں فردوس گم گشتہ کی تلاش کرتے رہے۔ یہ کھویا ہوا بہشت فی الاصل وہی قدیم تھا جسے شخصی املاک نے ختم کر دیا تھا لیکن جس کی یاد لوگوں کے ذہن سے محو نہ ہو سکی۔ اس خیالی اور مثالی معاشرے کو...... یونانی زبان میں اٹوپیا (لغوی معنی ہیں ''کہیں نہیں'' الف نافیہ ہے) کہتے ہیں۔

افلاطون (5ویں صدی قبل مسیح) سے لے کر فوریے اور اووین تک کئی خردمندوں نے اپنی اپنی اٹوپیا کے حوالے سے اشتمالی نظامِ معاشرہ کے حق میں قلم اٹھایا اور شخصی املاک کو انسان کے جملہ مصائب و آلائم کی جڑ قرار دیا۔ ہم مختصراً ان کا ذکر کریں گے۔

افلاطون نے اپنی مثالی ریاست کا تصور جمہوریہ اور قوانین کے مکالمات میں پیش کیا ہے۔ جمہوریہ کے شروع میں سقراط حاضرین سے پوچھتا ہے "عدل کیا ہے؟" اس سوال کے جواب میں بحث چھڑ جاتی ہے اور سقراط دوسروں کے خیالات کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ عدل کا قیام اسی معاشرے میں ممکن ہو سکتا ہے جس کے افراد قدرتی صلاحیتوں کے مطابق اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے ہوں۔ افلاطون کی اٹوپیا ایک اشتمالی ریاست ہے جس میں شخصی املاک کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے شہریوں کی خوراک' لباس' ٹھکانے' تعلیم و تربیت اور پیشے کا انتخاب ریاست کے ذمے ہے اس میں کنبے کو بھی شخصی املاک ہی کی ایک صورت سمجھ کر ختم کر دیا گیا ہے اور املاک کے ساتھ عورتوں اور بچوں کو بھی مشترکہ قرار دے دیا گیا۔ خاص تقاریب پر ریاست کی جانب سے مردوں اور عورتوں کو بچے پیدا کرنے کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ ماں کی عمر بیس اور چالیس برس کے درمیان اور باپ کی پچیس اور پچپن کے درمیان ہوتی ہے۔ عمر کی ان حدود کے باہر جنسی ملاپ کی اجازت ہے لیکن اس صورت میں اسقاط لازم ہے۔ کمزور بچے پیدا ہوتے ہی تلف کر دیئے جاتے ہیں' کوئی لڑکا یا لڑکی اپنے ماں باپ کو نہیں پہچانتا نہ ماں باپ اپنے بچوں کو جانتے ہیں چنانچہ لڑکے اور لڑکیاں ہر عمر رسیدہ مرد یا عورت کو ابا اور اماں کہہ کر پکارتے ہیں اور ایک دوسرے کو بھائی بہن کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ کوئی نوجوان کسی سالخوردہ شخص پر ہاتھ نہیں اٹھاتا مبادا وہ اس کا اپنا باپ ہو' بچے گھروں کی بجائے سرکاری درسگاہوں میں رہتے ہیں' جہاں صبح شام انہیں کڑی ورزش کروائی جاتی ہے' انہیں نصاب تعلیم کے ساتھ موسیقی کی تعلیم بھی دلائی جاتی ہے تا کہ ان کے ذہن و قلب میں ٹھہراؤ اور توازن پیدا ہو سکے لیکن ایسے نغمے نہیں سنوائے جاتے جو نفسانی ہیجان پیدا کرتے ہیں۔ اس ریاست سے ناٹک نویسوں کو نکال دیا گیا ہے کیونکہ بقول افلاطون یہ لوگ جعل اور جھوٹ کے پلندے ہوتے ہیں۔ وہ شاعروں کا ذکر بھی حقارت سے کرتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں شاعری محض ہرزہ سرائی ہے۔ البتہ بچوں کو منتخب کلاسیکی نظمیں سنائی جاتی ہیں جو شجاعت اور مردانگی

کے جذبات کو بیدار کرتی ہیں۔ طلبہ کو بھنا ہوا گوشت کھلایا جاتا ہے۔ مچھلی، اچار، چٹنیاں اور مربے کھانے کی ممانعت ہے۔ فوجی تربیت سب پر لازم ہے، ہر دس برسوں کے بعد امتحان لیا جاتا ہے۔ ممتاز اور منتخب نوجوانوں کو ریاضیات اور فلسفے کی اعلیٰ تعلیم دلائی جاتی ہے تاکہ وہ امورِ ریاست کو احسن طریقے سے سرانجام دے سکیں۔

افلاطون نے جس زمانے میں جمہوریہ لکھی، وہ تاریخ یونان کا زوال پذیر دور تھا۔ سپارٹا نے ایتھنز کو تابڑ توڑ شکستیں دے کر اس کی طاقت کو کچل دیا تھا۔ شکست خوردہ اقوام کا شیوہ ہے کہ وہ فاتحین کے طرزِ حیات اور عسکری طاقت سے مرعوب و مسحور ہو جاتی ہیں، چنانچہ افلاطون نے اپنی خیالی ریاست سپارٹا کی ریاست کے نمونے پر وضع کی تھی۔ افلاطون خود امراء کے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے اس نے اشتمالی اشرافیہ[1] کا تصور پیش کیا۔ جس میں غلام مشقت کرتے ہیں عوام کاریگر اور کاشتکار ہیں اور گنتی کے چند افراد کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور دے دی گئی ہے۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو افلاطون نے سیاسیات کو فلسفے کی بنیاد پر مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد علم ودانش، نیکی اور مسرت کا حصول ہے اور کوئی بھی شخص ریاست سے الگ تھلگ رہ کر ان سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ریاست کے قیام سے افراد کو علم، نیکی اور مسرت بہم پہنچانا مقصود ہے۔ ریاست کی تشکیل عقل و خرد کی روشنی میں کرنا ضروری ہے عقلیاتی قوانین صرف فلاسفر ہی وضع کر سکتے ہیں۔ اس لیے حکام کے لیے ضروری ہے کہ وہ فلسفی ہوں، ریاست کا پہلا اصول ہے، عقل، خرد۔ اس لیے حکام فلسفی ہوں گے۔ دوسرا اصول طاقت ہے تاکہ ان قوانین کو نافذ کیا جا سکے۔ یہ فریضہ تومند فوجی انجام دیں گے۔ تیسرا اصول محنت ہے جو عوام کریں گے۔ ان تین اصولوں سے تین طبقات بن جائیں گے۔ فلسفی، حکام، فوجی قائدین اور محنت کش عوام، کارل مارکس کے خیال میں افلاطون نے طبقات کا یہ تصور قدیم مصریوں سے مستعار لیا تھا۔

افلاطون کی ریاست کے روشن پہلو یہ ہیں کہ اس میں شخصی مفادات معاشرے اور ریاست کے مفادات کے تحت ہوں گے۔ شخصی مفادات شخصی املاک سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لیے جہاں کہیں شخصی املاک نہیں ہوں گی وہاں شخصی مفادات بھی نہیں ہوں گے۔

---

1 Aristocarcy

ایسے معاشرے میں ہر شخص اجتماعی بہبود کے لیے کام کرے گا اور اس طرح بالواسطہ اپنی ذاتی فلاح کے لیے بھی کام کر رہا ہوگا۔ شخصی املاک کا تدارک اور عورت مرد کی کامل مساوات افلاطون کی اٹوپیا کے سب سے قابلِ قدر پہلو ہیں۔

ایران میں شاہ قباد کے عہدِ حکومت میں مزدک نے ظہور کیا اور کامل اشتمالیت کی دعوت دی اور کہا کہ زر زن اور زمین ہر قسم کے فتنہ و فساد' قتل و غارت اور جرائم کا باعث ہیں۔ اس لیے انہیں سب انسانوں میں برابر برابر تقسیم کر کے معاشرے میں امن اور چین قائم کیا جا سکتا ہے اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کس قدر ناانصافی کی بات ہے کہ ایک شخص تو لاکھوں میں کھیلتا ہے' سیر حاصل اراضی اس کی املاک میں ہے اور حسین کنیزیں اس کے حرم کی زینت بنی ہوئی ہیں جبکہ دوسرا شخص فاقہ کشی اور تجرد کی زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ مزدک نے خیر اور شر کے مسئلے سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ اس دنیا میں شر رشک کی پیداوار ہے جس نے انسانی مساوات کا خاتمہ کر دیا ہے وہ اس مساوات کو دوبارہ قائم کرنے اور لالچ اور رشک کے استیصال کے لیے ظاہر ہوا ہے۔ نول کے خیال میں مزدک کی اشتمالیت اور جدید اشتمالیت میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ مزدک نے مذہب کے نام پر اشتمالیت کی دعوت دی تھی۔ شاہ قباد نے شروع شروع میں مزدک کی حمایت کی کیونکہ اس کی تعلیمات کی آڑ میں وہ جاگیرداروں اور موبدوں سے ان کی املاک چھین کر ان کا زور توڑنا چاہتا تھا لیکن جاگیرداروں نے ایکا کر کے اسے تخت و تاج سے محروم کر دیا اور اس کے بھائی جاماسپ کو بادشاہ بنا لیا۔ جب ایک مدت کی جدوجہد کے بعد قباد دوبارہ تخت و تاج حاصل کرنے کے قابل ہو گیا تو جاگیرداروں کے اصرار پر اس نے مزدک اور اس کے پیروؤں کا خاتمہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس کے بیٹے خسرو (بعد کا نوشیرواں) نے بھی اپنے باپ کو قائل کر لیا کہ مزدک کی تعلیم ریاست اور معاشرے کی بربادی کا عنوان بن جائے گی۔ قباد نے مزدک اور اس کے پیروؤں کو اپنے یہاں مدعو کیا' جب وہ سب مل کر بیٹھ گئے تو سپاہیوں نے انہیں قتل کر دیا۔ ایک عیسائی بشپ بازانس نے اس قتل عام کے چشم دید حالات لکھے ہیں' بادشاہ کے حکم پر مزدکیوں کو ملک بھر میں چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جس سے مشرق میں اشتمالیت کی روایت پروان نہ چڑھ سکی۔

ٹامس مور احیاء العلوم کے دور کا ایک انگریز عالم اور انسان دوست تھا' اس نے شاہِ وقت ہنری ہشتم کو کلیسیا کا صدر ماننے سے انکار کیا' جس کی پاداش میں اس کی گردن مار دی گئی۔ ٹامس مور کی اٹوپیا 1516ء میں شائع ہوئی۔ یہ فرضی ریاست ایک جزیرے کی شکل میں ہے' جس میں چوّن (54) شہر آباد ہیں' ان شہروں میں ایک ہی جیسے قوانین نافذ کر دیے گئے ہیں اور رسوم و رواج بھی ایک ہی جیسے ہیں۔ شہروں کا درمیانی فاصلہ چوبیس میل سے زیادہ نہیں ہے۔ ہر شہر کم و بیش ایک لاکھ باشندوں پر مشتمل ہے' اٹوپیا میں شخصی املاک کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ٹامس مور نے شخصی املاک کو معاشرے کی سب سے بڑی اور سنگین لعنت کہا ہے:

"مجھے اس خیال کے اظہار میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ جب تک شخصی املاک موجود ہے اور جب تک روپیہ ہر شئے کا معیار بنا ہوا ہے کسی بھی قوم میں انصاف اور مسرت پر مبنی معاشرہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ انصاف اس لیے نہیں ہوگا کہ بہترین چیزوں پر بدترین لوگوں کا قبضہ ہوگا اور مسرت اس لیے نہیں ہوگی کہ تمام اچھی چیزیں گنتی کے چند افراد کے تصرف میں ہوں گی۔"

اٹوپیا کے شہریوں اور دیہاتیوں میں کامل مطابقت پائی جاتی ہے' تمام شہریوں کو مقررہ مدت کے لیے کاشت کاری کرنی پڑتی ہے۔ پیداوار مودی خانوں میں ذخیرہ کر لی جاتی ہے۔ جہاں سے ہر شہری کی ضروریات پوری کر لی جاتی ہیں۔ اجرتوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اوقاتِ کار کم ہیں کسی قسم کا بیوپار کرنے کی اجازت نہیں ہے' سکے نہیں ڈھالے جاتے' ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کو معمولی دھاتیں سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون نے کنبے کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ٹامس مور کنبے کو بطور ایک معاشی اکائی کے بحال رکھنا چاہتا ہے۔ اٹوپیا ایک لادینی ریاست ہے۔ مذہبی پیشواؤں کا امورِ ریاست میں کوئی عمل دخل نہیں۔ تمام بچوں کو تعلیم و تربیت کے مساوی مواقع دیے جاتے ہیں۔ سنگین جرم کرنے والوں کو زنجیروں میں جکڑ کر ان سے کان کنی کا کام لیا جاتا ہے۔ شادی کا ذکر کرتے ہوئے ٹامس مور لکھتا ہے کہ نکاح سے پہلے دلہا اور دلہن کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حالتِ برہنگی میں دیکھ لیں تاکہ بعد میں جسمانی نقائص کا انکشاف بدمزگی کا سبب نہ ہو۔ اس نے کہا ہے کہ جرائم افلاس کی پیداوار ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ جرم اور افلاس کے اس رشتے سے

آج بھی بورژوا[1] ممالک میں انکار کیا جاتا ہے۔ ٹامس مور کی اٹوپیا کے روشن پہلو ہیں' اجرتوں اور شخصی املاک کا انسداد' کام کے اوقات کو چھ گھنٹوں میں محدود کرنا' صنعت و زراعت میں مطابقت تمام بچوں کو تعلیم و تربیت کی یکساں سہولتیں بہم پہنچانا اور افلاس کو جرائم کا اصل سبب قرار دینا۔ تاریک پہلو ہیں' جنگی قیدیوں کو غلام بنا کر ان سے مشقت لینا اور مجرموں کو غلام بنا کر ان سے خاکروبی اور کان کنی کے کام کرانا۔

ٹامس مور کی اٹوپیا کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد اطالیہ کے ایک عالم کمپانیلا کی ایک کتاب "شہر آفتاب" شائع ہوئی۔ اس فرضی شہر میں بھی شخصی املاک نہیں ہے' سونے چاندی کی بجائے محنت' عزت وقار کی علامت بن گئی ہے۔ عورتوں اور مردوں میں کامل مساوات پائی جاتی ہے۔ شہریوں کی تمام ضروریات مشترکہ پیداوار سے پوری کی جاتی ہیں۔ ذہنی کاوش اور ہاتھ کی مشقت میں فرق نہیں کیا جاتا۔ طبقاتی تفریق نہ ہونے کے باعث معاشرہ تضادات سے پاک ہے اور لوگ چین اور خوشی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ کمپانیلا کو اس بات کا احساس تھا کہ اپنے زمانے کے استحصالی معاشرہ میں اشتمالیت کی تبلیغ کر کے اس نے ترقی پرور قوتوں کی آبیاری کی تھی۔ اس نے بستر مرگ پر دم توڑتے ہوئے کہا تھا:

"میں وہ گجر ہوں' جو نئی صبح کی آمد کی خبر دیتا ہے۔"

18 ویں صدی کو یورپ کا خرد افروزی کا دور کہا جاتا ہے' یہ تحریک ہالینڈ اور فرانس سے آئی اور دیکھتے دیکھتے سارے یورپ میں پھیل گئی۔ اس کا آغاز بیل (1644ء-1706ء) سے ہوا جو سواں کی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری پندرہ برس واٹرڈم (ہالینڈ) میں بسر کیے' اس نے تاریخ' جغرافیہ' ادبیات' لسانیات' فلسفہ' الٰہیات اور اساطیر پر پُر مغز مقالات لکھے جنھیں بعد میں لغت کی صورت میں شائع کیا گیا۔ وہ ہر مسئلہ کو عقلیت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا اور مذہبیت کو اوہام پرستی قرار دیتا تھا۔ فرانسیسی فلاسفہ کی طرح مشہور انگریز مؤرخ گبن بھی بیل کے تشکک سے متاثر ہوا تھا۔ بیل نے مذہب اور ریاست کے قدیم گٹھ جوڑ کی جانب توجہ دلائی اور پادریوں کی دنیا طلبی اور ابلہ فریبی کا پردہ بڑی بے رحمی سے چاک کیا۔ فرانس کے قاموسی دانشور دیدرو' والیٹر' دولباخ' وایمر' کبانے

1۔ بورژوا...... بورژوا کا اصل معنی تجارت پیشہ کا ہے۔ بعد میں تمام جاگیرداروں' ساہوکاروں' صنعت کاروں اور تاجروں کو بورژوا کہنے لگے۔

اور کندور سے اس سے متاثر ہوئے۔ قاموسیوں نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ بادشاہ اور اس کے درباری عیش و عشرت کی دلدل میں غرق ہیں' جب کہ عوام فاقہ کشی اور قحط سے نڈھال ہو چکے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابھرتا ہوا تجارتی طبقہ جاگیرداروں کے جبر و استبداد سے نجات پانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ انقلابِ فرانس اسی کشمکش کا منطقی نتیجہ تھا۔ خرد افروزی کے ترجمانوں میں مابلی' میلیر' مودیلی لنگوئے' ہلویشیس اور دولباخ نے عقلیت' انسان دوستی اور اشتمالیت کے حق میں قلم اٹھایا۔

میلیر (1664ء-1729ء) اپنی کتاب عہد نامہ میں لکھتا ہے کہ مذہب شروع سے ریاست اور کلیسیا کے گٹھ جوڑ کا ایک فریق رہا ہے جس سے عوام کو ڈرا دھمکا کر مطلق العنان بادشاہوں کی اطاعت پر آمادہ کیا جاتا تھا۔ پروہتوں نے خدا کو ایک خوفناک حاکم کی شکل میں پیش کیا تاکہ اس کے حوالے سے وہ اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ میلیر کہتا ہے کہ اخلاق کی بنیاد عقل و خرد اور ذہانت پر رکھنا ضروری ہے اور اخلاق کو مذہبیت سے پاک کرنا لازم ہے:

> "پروہتوں اور پادریوں نے ایک طویل عرصے سے عوام کی نگاہیں آسمان پر مرکوز کر رکھی ہیں۔ اب ان نگاہوں کو زمین کی طرف واپس لوٹ آنا چاہیے۔"

میلیر کے خیال میں انسانی ذہن ناقابلِ فہم الٰہیات' مضحکہ خیز قصے' کہانیوں' طفلانہ رسوم اور گھمبیر اسرار سے اکتا چکا ہے۔ اب اسے طبیعی اشیاء قابل فہم اور سیدھی سادھی صداقتوں اور مفید معلومات کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو سوچنے' بولنے اور لکھنے کی آزادی دی جائے۔ تعلیم کو دنیوی اور لامذہبی بنایا جائے اور اس پر سے جملہ پابندیاں ختم کر دی جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ موجودہ معاشرتی نظام شر پر مبنی ہے۔ اس میں کروڑوں عوام اتھاہ جہالت اور رسوا کن افلاس میں مبتلا ہیں' جب کہ گنتی کے چند امراء اور جاگیردار ہوسناکی اور کاہلی کی شرمناک زندگی گذار رہے ہیں۔ شخصی املاک ہی شر کی جڑ ہے۔ تعلیم و تدریس' مذہب اور قانون سے شخصی املاک کا جواز پیش کیا جا رہا ہے۔ اب ایسے انقلاب کی ضرورت ہے جس سے اکثریت کے خلاف چند لوگوں کی اس سازش کو ختم کر دیا جائے۔ تمام شخصی املاک قوم کی تحویل میں دے دی جائے ہر شخص سے مناسب حد

تک کام لیا جائے اور پیداوار کی مساویانہ تقسیم کی جائے' مردوں' عورتوں کو میل جول کی آزادی دی جائے اور بچوں کی پرورش عوامی اداروں میں کی جائے۔ اس سے گھریلو جھگڑوں طبقاتی آویزش اور افلاس کا خاتمہ ہوگا۔

مابلی (1709ء-1785ء) لکھتا ہے:

"معاشرے کی تمام برائیوں کی جڑ شخصی املاک ہے۔"

اس کے خیال میں جب تک معاشی غلامی باقی و بحال ہے' سیاسی آزادی بے معنی ہے' اشتمالی معاشرے ہی میں انسان بچی خوشی اور نیکی سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ مابلی اشتمالی معاشرے کے قیام کے لیے انقلابی تحریک کو ضروری نہیں سمجھتا اور کہتا ہے کہ اس سے صرف محدود فوائد ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

موریلی نے اپنی تصنیف "قانونِ فطرت" میں اشتمالی نصب العین کی جامع تشریح کی ہے' وہ کہتا ہے کہ انسان بالطبع نیک ہے۔ معاشرتی جبلتیں اسے نیک کاموں کی طرف مائل کرتی ہیں۔ لیکن شخصی املاک نے انسان کے اخلاق و کردار کو تباہ کر دیا ہے۔ شخصی املاک کے باعث اس میں خودنمائی' تکبر' جاہ طلبی' خباثت اور ریاکاری پیدا ہو گئی ہے۔ حصولِ املاک کے خبط نے تمام برائیوں کو تقویت دی ہے۔ سوفسطائی کہتے تھے کہ انسان بالطبع اشتمالیت سے نفور ہے۔ حالانکہ اشتمالیت سے انحراف کے باعث انسان جو بالطبع نیک تھا شریر اور خبیث بن گیا۔ اگر انسان لالچ' نفرت' انانیت اور رقابت سے پاک ہوتا' جنہیں شخصی املاک نے پروان چڑھایا ہے تو وہ نہایت امن اور سکون سے بھائیوں کی طرح مل جل کر رہ سکتا تھا۔ معاشرے کو نئے سرے سے تعمیر کرتے وقت ضروری ہوگا کہ اخلاقیات اور سیاسیات کے بارے میں کھل کر بحث کی جائے۔ دانشوروں کو اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ ان غلط تصورات پر جرح کر سکیں جن کے باعث شخصی املاک کے ادارے کا قیام عمل میں آیا تھا۔ شخصی املاک کو صرف ان اشیاء تک محدود کر دیا جائے جو کسی فرد کی ذاتی ضروریات ہوتی ہیں۔ ہر قسم کی پیداوار کو ذخیرہ کر کے اسے تمام شہریوں پر ان کی ضروریات کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔ ہر تندرست آدمی سے کام لیا جائے اور طفیل خوار بے کار طبقے کا خاتمہ کر دیا جائے۔ موریلی کی کتاب "قانونِ فطرت"[1] ہی سے وہ اصول لیا گیا ہے جو

1۔ Code of Nature

بعد میں اشتمالی انقلاب کا نعرہ بن گیا تھا۔

"ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق'
ہر ایک سے اس کی۔ قابلیت کے مطابق"

ہنری لنگوئے نے اپنی کتاب "سیاسی تواریخ" [1] میں لکھا ہے کہ جس املاک کو طاقت اور دھوکے سے حاصل کیا جاتا ہے اس کے جواز اور تحفظ کے لیے قانون کو آلۂ کار بنا لیا جاتا ہے۔

"مروجہ قوانین کا مقصد اولین شخصی املاک کا تحفظ ہے کہ ان کی مدد سے امراء کی جائیداد کو کنگلوں سے بچایا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات ناقابلِ یقین ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ قوانین بعض پہلوؤں سے عوام کے خلاف گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہیں۔"

وہ کہتا ہے کہ سرمایہ داروں اور محنت کشوں میں آویزش شروع ہوئی کیونکہ محنت کش اپنی قوتِ بازو اپنے آقاؤں کے ہاتھ بیچنے پر مجبور ہے۔ اگرچہ غلامی کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود امراء اشیاء کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں' جس سے محنت کش ان کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔ سابقہ دور میں غلاموں کو کم از کم خوراک لباس اور ٹھکانے کی تشویش نہیں ہوتی تھی لیکن آزاد معاشی نظام میں جب بھی کوئی آقا یہ محسوس کرے کہ اسے محنت کشوں کی خدمات سے خاطر خواہ مالی فائدہ نہیں پہنچ رہا تو وہ انہیں کام سے ہٹا سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کی درستی صرف اشتمالی انقلاب ہی سے ہو سکتی ہے۔ ہلویشیس نے اپنی کتاب "ذہانت کے بارے" (On Intellect) میں لکھا کہ فلسفے کا کام اخلاق کو مذہبی عقائد سے پاک کر کے اسے از سرِ نو وضع کرنے اور اسے ترقی دینے کا ہے۔ اس کے خیال میں افراد و اقوام کی ہمہ گیر زبوں حالی کے دو اسباب ہیں:

1- ناقص قوانین
2- پیداوار کی نامنصفانہ تقسیم

وہ کہتا ہے کہ ہر ملک میں دو طبقے موجود ہوتے ہیں' ایک وہ جو ضروریات کی اشیاء کے لیے ترستا رہتا ہے اور دوسرا وہ جو عیش و عشرت میں غرق رہتا ہے۔ دولباخ نے اپنی

1۔ Political Annals

کتاب ''عیسائیت کا کچا چٹھا'' [1] میں کلیسیا اور ریاست کے گٹھ جوڑ پر تنقید کی ہے۔ اس نے ''مذہب عوام کے لیے افیون ہے'' کہہ کر کارل مارکس کی پیش قیاسی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مذہب لوگوں کو جوشِ جنون سے سرشار کر دیتا ہے جس کے باعث وہ ان مظالم کے انسداد کی طرف توجہ نہیں دے سکتے' جو حکام ان پر ڈھاتے رہتے ہیں۔ ریاست اور کلیسیا عوام کو نامعلوم اور مخفی قوتوں کا خوف دلا کر انہیں جور و ستم کو خاموشی سے برداشت کرنے پر آمادہ کر لیتے ہیں جو حکومت کے کھلے قوانین ان پر توڑ رہے ہیں۔ عوام کو یہ امید دلائی جاتی ہے کہ اگر وہ اس دنیا میں زبوں حالی کی زندگی قبول کر لیں گے تو اگلے جہاں میں مسرتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اخلاق کو مذہبی عقائد کی بناء پر مرتب کرنا خطرناک ہے کیونکہ مذہبی عقائد بدلتے رہتے ہیں اور ان کا خاتمہ اخلاق کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ لہٰذا مذہبی اخلاق کی بجائے طبعی اخلاق کی تلقین کرنا انسب ہے۔ دولباخ نے ضمیر کو ''پولیس کا خوف'' کہہ کر فرائڈ کی پیش قیاسی کی تھی' وہ کہتا ہے' ہم امراء کو دیکھتے ہیں کہ وہ کبھی بھی ضمیر کی خلش کو محسوس نہیں کرتے' نہ انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے غریبوں پر ظلم کر کے اپنی دولت اکٹھی کی ہے۔ دولباخ نے لاک اور کارل مارکس سے کہیں پہلے اس خیال کا اظہار کیا کہ محنت ہی دولت کا ماخذ ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''ایک کاروباری آدمی سے زیادہ خطرناک کوئی شخص نہیں ہوتا' وہ ہر وقت اپنے شکار کی تلاش میں رہتا ہے۔ کئی اقوام کاروباری طبقے کی شکار ہو جاتی ہیں' انہیں دولت کی امید دلا کر لوٹا جاتا ہے۔ اس لوٹ کھسوٹ سے ملک تباہ ہو جاتے ہیں۔ محصولات میں اضافہ ہوتا ہے' عوام فاقے کرتے ہیں تا کہ چند لوگوں کی حرص و ہوس کی تشفی ہو سکے۔''

اس کا قول ہے:

> ''ایک امیر آدمی یا تو لفنگا ہوتا ہے یا کسی لفنگے کا وارث ہوتا ہے۔''

وہ پوچھتا ہے:

> ''کیا اقوامِ عالم کے عوام چند بے کار' اخلاق باختہ' سنگ دلوں کی عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنے اور ان کی حرص اور خودنمائی کی تسکین کے لیے

[1] Christianity Exposed

محنت و مشقت کرتے رہیں گے۔"

پھر لکھتا ہے:

"کم و بیش تمام اقوامِ عالم میں آبادی کی تین چوتھائی افلاس زدہ ہے۔ جبکہ گنتی کے چند افراد تمام املاک اور دولت پر قابض ہیں' عوام کے آقا بنے بیٹھے ہیں اور دوسروں کی کمائی پر گلچھرے اڑا رہے ہیں...... انسان خبیث اس لیے نہیں ہے کہ وہ خبیث پیدا ہوتا ہے بلکہ اسے خبیث بنا دیا جاتا ہے۔ طاقتور امراء غریب عوام کو کچل کر رکھ دیتے ہیں اور ان سے باز پرس کرے بھی کون؟ حکومت کی باگ ڈور انہی اُمراء کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔"

گراکس بابیو (1760ء-1797ء) اور اس کے ساتھیوں نے انقلابی جمہوریہ کے نام پر تحریک چلائی اور معاشی و عمرانی مساوات کی بنیاد پر ایک منصفانہ معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی' جس کے بے نقاب ہونے پر بابیو کو گلوٹین پر موت کی سزا دی گئی۔ بابیو کی اس تحریک نے بورژوا اور پرولتاریہ کا وہ اتحاد ختم کر دیا جو انقلاب فرانس کے دوران عمل میں آیا تھا کیونکہ بورژوا نے محنت کشوں کو ان کے جائز حقوق دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بابیو اور اس کے پیرو تحریک خرد افروزی کی عقلیت' اشتمالیت اور انقلابیت کے ترجمان تھے اور میلیر او رموریلی کی تحریروں سے متاثر ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بابیو کی تحریک نے اشتمالیت کو ایک قدم اور آگے بڑھایا اور نئے نئے معاشی اور عمرانی رجحانات کی انقلابی انداز میں ترجمانی کر کے تاریخ میں پہلی بار (1) اشتمالی نظریے کو ایک انقلابی تحریک بنانے کی کوشش کی۔ (2) اشتمالی انقلاب لانے کے بعد پرولتاریہ کی آمریت قائم کرنے کا تصور پیش کیا۔ (3) امیر اور غریب' آقا اور غلام' جاگیردار اور مزارع کے مابین تاریخی آویزش کی نشان دہی کر کے اشتمالیت کے خواب ناک تخیل کو عملی اور تحقیقی اسلوب عطا کیا۔

انیسویں صدی کے اٹوپیائی اشتمالیت پسندوں نے بھی 18ویں صدی کی تحریکِ خرد افروزی سے ذہنی و ذوقی فیضان حاصل کیا۔ انہیں موریلی' میلیر' بابیو وغیرہ کی معنوی اولاد سمجھا جا سکتا ہے۔

شارل فوریئے (1792ء-1837ء) نے بورژوا معاشرے پر عالمانہ نقد لکھا اور غربت اور تمول کا تضاد واضح کیا۔ اپنے مادیت پسند پیشرووں کی طرح اس کا خیال بھی یہی تھا کہ مادی احوال کے اثرات انسانی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً نیک ہے لیکن نامنصفانہ معاشرے میں اس کا اخلاق پست اور اس کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس میں قصور انسان کا نہیں بلکہ معاشرے کا ہے لہٰذا ایسا معاشرہ قائم کرنا ضروری ہے جس میں انسان کی صلاحیتوں کو بارآور ہونے کے مواقع میسر آسکیں اور اس کی فطرت کے مثبت اور تعمیری جذبات پروان چڑھ سکیں۔ اس نے کہا کہ مستقبل کا معاشرہ پیداواری اکائیوں (فلانجے) پر مشتمل ہوگا' جس کے تمام افراد محنت کریں گے۔ اوقاتِ کار گھٹا دیے جائیں گے' محنت ایک مسرت آمیز فریضہ بن جائے گی' جس سے پیداوار میں اک گونہ اضافہ ہوگا۔ ہر معاشی اکائی میں کام اور لیاقت کے بموجب افراد میں پیداوار تقسیم کی جائے گی' شہری اور دیہاتی کا تضاد رفع ہو جائے گا۔ ہاتھ سے کام کرنے والے اور ذہنی کاوش کرنے والے میں کسی نوع کا امتیاز باقی نہیں رہے گا' دوسرے اشتمالی اٹوپیاؤں کی طرح فوریے نے بھی پرولتاریہ کے تاریخی کردار سے اعتناء نہیں کیا' نہ معاشرے کی تعمیرِ نو کے لیے انقلاب کو ضروری سمجھا ہے اس کا خیال تھا کہ پرامن ترغیب و ابلاغ سے سرمایہ داروں کو منصفانہ رویہ اختیار کر کے اشتمالی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس نے سرمایہ دارانہ نظامِ معاشرہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس میں آبادی کا 1/8 حصہ 7/8 حصے کو لوٹتا ہے اور مزدور جتنی محنت کرتا ہے اتنا ہی زیادہ محتاج اور مفلس ہو جاتا ہے۔

نکولائی چرنی شیوفسکی (1828ء-1889ء) روس کا مادیت پسند انقلابی مفکر تھا' جسے 1862ء میں انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں سائبیریا میں عمر قید با مشقت کی سزا سنا دی گئی تھی' چرنی شیوفسکی' روسی انقلابیوں کا پرجوش رہنما تھا۔ اس نے زار شاہی کا تختہ الٹنے کی تحریک میں سرگرمی سے کام کیا۔ وہ روسی اہلِ قلم ہرزن اور بلینسکی کے علاوہ جرمن مفکر فوئرباخ کی مادیت سے بھی متاثر ہوا تھا' اس نے کھیت غلاموں کو آزادی دلانے کے لیے جدوجہد کی اور ان میں انقلابی شعور پیدا کیا۔ بحیثیت ایک مادیت پسند کے اس نے کانٹ کی مثالیت پر کڑی تنقید کی' اس کا عقیدہ تھا کہ انسان اپنے حواسِ خمسہ کے واسطے سے معروضی عالم کا جو علم حاصل کرتا ہے' وہی یقینی ہوتا ہے۔ اس نے عمل کو نظریے کی صداقت

کی کسوٹی قرار دیا ہے اور کہا کہ جو علم یا نظریہ عمل کے معیار پر پورا نہ اترے وہ قابلِ لحاظ نہیں ہوتا۔ چرنی شیوفسکی کی تحریروں سے مفہوم ہوتا ہے کہ نظریے اور عمل کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر جدلیاتی تھا۔ اس کا یہ خیال بھی قابلِ قدر ہے کہ تاریخ عوام بناتے ہیں' لہٰذا عوام کے مفادات کو اولیت دینا ضروری ہے۔ کارل مارکس نے چرنی شیوفسکی کی گراں قدر دین کا اعتراف کیا ہے۔

19ویں صدی کے بعض اٹوپیائی اشتمالیت پسندوں نے مثالی ریاست کی عملی تشکیل کے لیے کچھ تجربات بھی کیے۔ کابے نے آئی کیرین کی تنظیم قائم کی اور "نئی جنت" بسانے کے لیے اس کے ارکان کو بحری جہاز میں سوار کرا کے اضلاع متحدہ امریکہ میں لے گیا لیکن وہاں کسی نے توجہ نہ کی اور اس کا تجربہ ناکام ہو گیا' اوون نے ایک اشتمالی بستی بسائی' جس کی سیر حاصل اراضی پر باغات لگوائے اور کاشت کاری شروع کی لیکن کچھ عرصہ بعد اس نے دل شکستہ ہو کر اپنی ناکامی کا اعتراف کیا اور اس منصوبے کو ترک کر دیا گیا۔

آخر میں پرودوں کی کتاب "املاک کیا ہے؟" قابلِ ذکر ہے۔ اس میں پرودوں کہتا ہے تمام "املاک چوری ہے" اس کتاب سے جو پڑھے لکھے انقلابی متاثر ہوئے ان میں کارل مارکس بھی شامل تھا جو شروع شروع میں پرودوں کا مداح تھا لیکن بعد میں اختلافِ رائے کے باعث اس سے الگ ہو گیا۔ پرودوں نے کہا کہ وہی آمدنی جائز ہو سکتی ہے جو کسی شخص نے اپنی قوتِ بازو سے کمائی ہو۔ اس کے خیال میں دنیا کے بدترین لوگ وہ ہیں جو خود تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں اور دوسروں کی مشقت کی کمائی غصب کر لیتے ہیں' وہ سود خواری کو بھی ایک لعنت سمجھتا تھا۔

افلاطون سے لے کر اوون تک اٹوپیا کے مصنفین نے اشتمالیت کی روایت کا تحفظ ہی نہیں کیا بلکہ اس کی آبیاری بھی کی۔ ان زمانوں میں جب شخصی املاک کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے اسے تمام معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کی جڑ قرار دیا۔ مشترکہ املاک کی اہمیت واضح کی اور پیداوار پر ہر شخص کا مساویانہ حق تسلیم کیا۔ انہوں نے اس زمانے میں عورت مرد کی برابری کا ذکر کیا' جب عورت مرد کے دل بہلاوے کی گڑیا سمجھی جاتی تھی۔ انہوں نے ہر شخص کو اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی ترغیب دی' جب کام کرنے والے کو کمینہ (لغوی معنی کام کرنے والا) کہا جاتا تھا۔ انہوں نے ہر بچے کو تعلیم و تربیت کا حق دیا' جب

تعلیم و تربیت امراء کے بچوں تک محدود تھی' ان وجوہ کی بنا پر اٹوپیا کھوئے ہوئے بہشت کی مثیل اور منصفانہ معاشرے کی علامت بن گئی۔ اٹوپیائی اشتمالیت پسندوں نے جوروا ستبداد کے گھور اندھیروں میں صدیوں تک انسان دوستی اور معاشی مساوات کی قندیل کو روشن رکھا اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جس کے انتظار میں دکھی عوام کئی صدیوں سے چشم براہ تھے یعنی کارل مارکس اور انجلو نے اس سنہرے تخیل کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے اپنی انقلابی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اٹوپیائی اشتمالیت پسندوں کی ہمدردیاں بلاشبہ عوام کے ساتھ تھیں لیکن ان کی نگاہ محنت کش عوام کے تاریخی انقلابی کردار تک نہ پہنچ سکی جس کے باعث وہ کوئی مؤثر عملی اقدام کرنے میں ناکام رہے۔

جدلیات:

جدلیات یونانی زبان کی ایک ترکیب کا ترجمہ ہے' جس کا لغوی معنی ہے ''بحث اور مناظرے کا فن'' اس میں مکالمے کا اسلوب اختیار کیا جاتا تھا۔ کارل مارکس کی رو سے جدلیات ان عمومی قوانین کا علم ہے جو نیچر معاشرے اور فکرِ انسانی کی نشوونما اور ارتقاء پر حاوی ہیں۔ یونانیوں کے ہاں جدلیات کا مفہوم یہ تھا کہ ہر شئے تغیر پذیر ہے اور اپنی ضد سے قائم ہے جو اس کے بطون میں موجود ہوتی ہے۔ اشیاء کا داخلی تضاد ہی ان کی حرکت و تغیر کا باعث ہوتا ہے۔ فیثا غورس کے پیرو اور ہیریکلیٹس جدلیات کا یہی مطلب لیتے تھے۔ اگرچہ ان کے زمانے میں ابھی یہ ترکیب وضع نہیں ہوئی تھی۔ ہیریکلیٹس کہتا تھا کہ روح آگ اور پانی سے مرکب ہے۔ آگ اعلیٰ ہے اور آب پست ہے۔ اس کے خیال میں کائنات کی ہر شئے آگ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

> ''یہ عالم کسی انسان یا دیوتا نے نہیں بنایا۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ازلی اور ابدی آگ کی صورت میں ہمیشہ برقرار رہے گا' اس کے بعض حصے بجھ رہے ہیں اور بعض جل رہے ہیں۔''

پھر کہتا ہے:

> ''جب تک اضداد نہ ملیں' مفاہمت نہیں ہوتی' تضاد ہی ہمارے لیے اچھا ہے۔''

اس کا عقیدہ یہ تھا کہ کائنات کی ہر شئے ہر وقت تغیر پذیر ہے۔ اس میں سکون اور جمود کا کوئی وجود نہیں۔ اس کی مثال دیتے ہوئے اس نے کہا:

''ہر روز نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔'' اور

''تم ایک ہی ندی میں دو بار پاؤں نہیں رکھتے۔''

تغیر پذیری اور تضاد کے انہی اصولوں پر بعد میں ہیگل نے اپنے فلسفے کو مرتب کیا تھا۔ ارسطا طالیس کے بقول زینوالیاطی جدلیات کا موجد تھا۔ زینو' پارمی نائیڈیس کے اس نظریے کا حامی تھا کہ کائنات میں ہر کہیں سکون ہی سکون ہے اور تغیر و تبدل کا کوئی وجود نہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں اس نے اپنی تیر کی مشہور مثال دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اڑان کے وقت تیر بیک وقت دو جگہوں پر نہیں ہو سکتا اور کسی نہ کسی نقطے پر ساکن ہوتا ہے۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ حرکت کر رہا ہے اور تیر کی ظاہری حرکت ہماری نظروں کا فریب ہے' جسے ہم حرکت سمجھتے ہیں' اصل میں وہ سکون ہی کی مختلف حالتوں سے عبارت ہے۔ یہ کہہ کر زینو نے اس تضاد کی جانب توجہ دلائی جو حرکت اور سکون میں موجود ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سکون حقیقی ہے اور حرکت جو اس کی ضد ہے' اعتباری ہے۔ زینو نے اپنی اس دلیل کے دوسرے پہلو کو نظر انداز کر دیا یعنی ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تیر کی اڑان میں حرکت کے ساتھ اس کی ضد سکون موجود ہے' جو اس کی حرکت کا باعث ہوتی ہے۔ گویا حرکت کے بغیر سکون کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا' جیسے تاریکی کے بغیر روشنی کا' جھوٹ کے بغیر سچ کا' برائی کے بغیر نیکی کا' غم کے بغیر خوشی کا اور بدصورتی کے بغیر حسن کا تصور کرنا محال ہے۔ ارسطا طالیس نے زینو کی جدلیات ہی کو ازسرِ نو اپنی قیاسی منطق کی صورت میں مرتب کیا تھا۔ افلاطون کہتا ہے کہ امثال کی اصل اور ترکیب کو جدلیاتی اسلوب ہی سے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے نوفلاطونیوں کے ہاں بھی جدلیاتی اندازِ فکر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ احیاء العلوم کی صدیوں میں برونو کا طرزِ استدلال جدلیاتی ہی تھا۔ جس کے باعث وہ کلیسیا کا معتوب ٹھہرا اور اسے سولی پر گاڑ کر زندہ جلا دیا گیا۔ دیدرو اور روسو نے بھی جدلیاتی اندازِ فکر کی طرف اشارے کیے ہیں۔ جرمن مثالیت پسندوں نے اپنے جدلیاتی استدلال سے حقیقت کو سکونی کی بجائے حرکی قرار دیا ہے البتہ علم کے ماخذ کا صحیح وقوف نہ ہونے کے باعث وہ جدلیات سے انصاف نہ کر سکے۔ کانٹ نے امثال کے تضاد کا ذکر کیا ہے لیکن

اس کے ساتھ ہی اس نے عقلیاتی کاوشوں کو بے مصرف اور بے ثمر قرار دیا جس سے جرمن فلسفے میں خرد دشمنی اور رومانیت کی روایت نے بار پایا۔ بعد کے فلاسفہ فشٹے' شیلنگ' شلائر ماخر' شوپنہار اور ایوکن اسی خرد دشمنی کی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہیگل کا نظام فکر بے شک عقلیاتی اور منطقی ہے لیکن اس کے افکار پر بھی سریت[1] کی پرچھائیں دکھائی دیتی ہیں۔

ہیگل نے کانٹ' فشٹے اور شیلنگ کے فلسفیانہ افکار کو فکری وحدت دینے کی کوشش کی ہے۔ ہیگل کے فلسفے کا اصل اصول یہ ہے کہ کائنات ذہن کا ارتقاء ہے۔ نیچر سے عین مطلق[2] کی طرف بتدریج انکشاف کا عمل جاری ہے' جسے اس نے جدلیات یا اصول تضاد کا نام دیا ہے وہ کہتا ہے کہ افکار اپنے اضداد میں بدل جاتے ہیں اور یہ عمل ساری کائنات میں جاری ہے۔ پہلے ہم مثبت افکار[3] کا انکشاف کرتے ہیں' پھر ہم ان کے منفی افکار[4] کو پا لیتے ہیں۔ مثبت اور منفی کا اتحاد[5] عمل میں آتا ہے' جو بذات خود مثبت بن جاتا ہے اور یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ البتہ نئے مثبت میں سابق اتحاد کا جوہر محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسے وہ قدروں کا تحفظ کہتا ہے۔ ایک مثالیت پسند ہونے کی حیثیت سے وہ کہتا ہے کہ کائنات میں ذہن ہی ہر کہیں تخلیق کر رہا ہے۔ ذہن ازل میں مخفی طور پر کائنات میں موجود تھا۔ جو درجہ بدرجہ اپنے آپ کو منکشف کر رہا ہے۔ اس نے کہا کہ فکر ہی وجود ہے اور فکر ہی حقیقی ہے۔ کائنات فکر کی تمثال ہے۔ عین مطلق ازلی و ابدی اور اکمل ہے۔ اس میں کائنات کے تمام تضادات کی مفاہمت ہو جاتی ہے۔ ہیگل کا عین مطلق ارسطا طالیس کے خدا سے ملتا جلتا ہے یعنی وہ ایسی فکر ہے جو اپنی ہی ذات پر تدبر کر رہی ہے' یاد رہے کہ ارسطا طالیس کے فلسفے میں بھی ارتقاء کا تصور موجود ہے۔ ہیگل کے خیال میں کائنات کا ارتقاء انہی خطوط پر ہو رہا ہے جن خطوط پر فکر کا ارتقاء ہوتا ہے۔ نیچر میں یہ عمل غیر شعوری ہوتا ہے۔ جیسے پودا بیج کی نفی کر دیتا ہے' انسان میں یہ عمل شعوری ہوتا ہے' مثبت' منفی اور اتحاد کا عمل ہی کائنات اور حیات میں تسلسل و ارتقاء کو برقرار رکھتا ہے۔ ذہن انسانی اور کائنات میں ایک ہی جیسے جدلیاتی اصول کارفرما ہیں۔ ہیگل کی جدلیات کے اصول درج

1. Mysticism 2. Absolute Ideal 3. Thesis
4. Anti-thesis 5. Synthesis

ذیل ہیں:

(1) تضاد' (2) جدل و پیکار' (3) مثبت و منفی کا اتحاد'
(4) نفی کی نفی[1]' (5) کمیت[2] کا کیفیت[3] میں بدل جانا'
(6) قدروں کا تحفظ[4]

ہیگل کے نظریئے کی رو سے کائنات ازلی و ابدی ہے اور تضاد ہی تاریخ اور حیات کی حرکت و ارتقاء کا اصول ہے۔ افکار میں جو تضادات موجود ہوتے ہیں' وہی ان کی نفی کر دیتے ہیں۔ اتحاد سے نفی کی نفی ہو جاتی ہے اور افکار کا ارتقاء ایک قدم اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ البتہ سابقہ افکار کی صداقت بدستور قائم رہتی ہے یہی قدروں کا تحفظ ہے۔ جس طرح بیج پودا پھول اور پھل ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں لیکن ان سب میں نشوونما کا جوہر باقی رہتا ہے' جب ٹہنی سے خوشبودار پھول کھلتا ہے تو خوشبو کی صورت میں ٹہنی کی کمیت کیفیت میں بدل جاتی ہے۔ ہیگل مثالیت پسند ہے۔ اس لیے اس کی جدلیات افکار کی آویزش تک محدود رہی' دوسرے مثالیت پسندوں کی طرح اس نے مادے کے معروضی وجود سے انکار کیا اور مادی دنیا کو ظنی اور اعتباری قرار دیا۔ اس کے خیال میں مادی کائنات محض ایک آئینہ ہے جس میں عین مطلق کے انکشاف ذات کا عکس پڑتا ہے۔ اس کی فلسفیانہ دین دو پہلوؤں سے قابلِ قدر ہے:

1- کائنات ٹھوس اور جامد شے[5] نہیں ہے بلکہ ایک حرکی عمل[6] ہے۔

2- اس کے وضع کیے ہوئے جدلیاتی اصول جن کی مادی ترجمانی کر کے کارل مارکس نے جدلیاتی مادیت کا فلسفہ مرتب کیا تھا۔

مادّیت:

فلسفے کا آغاز مادیت سے ہوا تھا۔ سائنس اور فلسفہ کے بانی طالیس (550-624 ق م) نے اس کا تحقیقی جواب دینے کی کوشش کی کہ کائنات کیسے بنی ہے اور اس کی اصل کیا ہے؟ طالیس نے کہا کہ کائنات پانی سے بنی ہے اور پانی ہی اس کا اصل ہے۔ طالیس کی یہ

1- Negation of Negation 2- Quantity 3- Quality
4- Conservation of Values 5- Static 6- Dynamyc

تحقیق اس لحاظ سے قابلِ قدر نہیں ہے کہ اس نے پانی کو کائنات کی اصل قرار دیا تھا۔ بلکہ اس لیے اہم ہے کہ اس نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ کائنات کو کسی خداوند خدا بعل مردوک آمن رع یا زیوس پیٹر نے بنایا ہے اور کائنات کی تکوین کے طبیعی اسباب تلاش کرنے کی ابتداء کی۔ طالیس کے بعد ہیریکلیٹس نے دعویٰ کیا کہ کائنات آتش سے بنی ہے اور زمین ہوا کی طشتری پر تیر رہی ہے۔ ایمپی ڈکلیس نے عناصر اربعہ کا نظریہ پیش کیا اور کہا کہ کائنات پانی' ہوا' آگ اور مٹی سے بنی ہے۔ اشیاء انہی چار عناصر کی ترکیب اور انتشار سے بنتی اور بگڑتی ہیں۔ دیما قریطس کے خیال میں جملہ اشیاء انسان سمیت ایٹموں سے مرکب ہیں۔ حتیٰ کہ انسان کی روح بھی ایٹموں سے بنی ہے' جنہیں انسان سانس کے ذریعے اندر کھینچتا اور باہر نکالتا رہتا ہے۔ موت کے بعد یہ ایٹم منتشر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا حیات بعد موت کا کوئی وجود نہیں ہے۔

مادیت کو ذہن نشین کرنے کے لیے مثالیت کا بھی مختصراً ذکر کرنا ضروری ہوگا کیونکہ فلسفے کے یہ دونوں مکاتب قدیم زمانے سے دوش بدوش پہنچتے آرہے ہیں۔ مثالیت کی ابتداء فیثا غورس سے ہوئی تھی اور افلاطون اس کا مشہور شارح تھا۔ افلاطون کہتا ہے کہ امثال[1] ازلی ابدی ہیں۔ غیر مخلوق ہیں اور مادی اشیاء انہی امثال کے سائے ہیں۔ مادہ خام مواد ہے' جس پر امثال کی چھاپ لگتی رہتی ہے اور عالم مادی کی اشیاء ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ افلاطون نے کہا کہ امثال کا عالم حقیقی ہے اور مادی عالم محض اس کا سایہ ہے اور اس لیے غیر حقیقی اور اعتباری ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی کوتاہیاں اور خامیاں ہیں وہ سب مادے ہی کی وجہ سے ہیں۔ امثال کے عالم یا حقیقی عالم کو عقلِ استدلال ہی سے جانا جاتا ہے حواس اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مادہ ناقص ہے اور جن امثال کی چھاپ اس پر لگتی ہے انہیں بھی بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ افلاطون کی امثال لاتعداد ہیں' جس طرح حسن' خیر اور صداقت کے اعلیٰ امثال ہیں۔ اسی طرح شر باطل اور قبح کے بھی امثال موجود ہیں۔ سب سے اعلیٰ خیر مطلق ہے۔ افلاطون نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ خیر مطلق سے شر کیوں کر نکلا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ذہن اپنی خالص صورت میں ایک ستارے پر موجود تھا۔ اس پر عالمِ حواس کی کشش غالب آگئی تو اس نے جسم کی قید قبول کر لی۔ اب وہ اپنے آپ کو اس قید سے آزاد

Ideas .1

کرا کے دوبارہ اس ستارے کو لوٹ جانا چاہتا ہے۔ اسی طرح مادے کی گرفت میں آنے سے پہلے روحیں اپنے ستاروں میں موجود تھیں۔ نیک آدمی کی روح موت کے بعد اپنے اصل مسکن کو لوٹ جاتی ہے۔ بد روحیں موت کے بعد اپنے اعمالِ بد کی پاداش میں نیا قالب اختیار کر لیتی ہیں۔ انسان میں دو قسم کی روحیں ہیں۔ ایک فانی' دوسری غیر فانی۔ غیر فانی روح خدا پیدا کرتا ہے' فانی روح لذات و شہوات کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ سبب کہ غیر فانی روح نفسانی خواہشات پر قابو پا لیتی ہے۔ غیر فانی روح کا مقام سر ہے اور فانی روح سینے میں قیام کرتی ہے۔ افلاطون کے خیال میں صرف فلاسفہ ہی عالمِ امثال کا ادراک کر سکتے ہیں۔ عوام ظاہری یا مادی عالم کے طلسم میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

افلاطون کی سیاسیات' اخلاقیات اور جمالیات میں بھی اس کی مثالیت کارفرما ہے اس کی موت کے بعد اس کے شاگردِ عزیز ارسطا طالیس نے اس کی تعلیم کو جاری رکھا۔ ارسطا طالیس نے اپنے استاد کی مثالیت کو قبول کر لیا اور امثال کو ازلی و ابدی تسلیم کیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ امثال مادی اشیاء سے الگ تھلگ کسی عالمِ مثال میں موجود نہیں ہیں بلکہ انہی اشیاء میں نفوذ کیے ہوئے ہیں اور تمام مادی اشیاء اپنے اپنے امثال کی جانب حرکت کر رہی ہیں۔

مادیت اور مثالیت میں فرق یہ ہے کہ مادیت میں مادے کو کائنات کا اصل اصول مانا گیا ہے جب کہ مثالیت میں ذہن ہی کائنات کا اصل اصول ہے۔ مادیت پسند عالم مادی ہی کو حقیقی سمجھتے ہیں جبکہ مثالیت پسند حقیقی اور غیر حقیقی یا ظاہری اور باطنی عالم میں تفریق کرتے ہیں۔ ان کے یہاں مادی عالم غیر حقیقی ہے۔ مادیت پسند کائنات میں چند واضح قوانین کی کارفرمائی کو تسلیم کرتے ہیں جن میں سلسلۂ سبب و مسبب[1] سب سے اہم ہے جس کی رو سے کوئی مسبب بغیر سبب کے معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا اسی بنا پر وہ جبر کے قائل ہے۔ اس کے برعکس مثالیت پسند قدر و اختیار کو مانتے ہیں اور فطری قوانین کے جبر سے اعتناء نہیں کرتے۔ مادیت پسند روح کے منکر ہیں اور ذہن کے ساتھ روح کو بھی مادی سمجھتے ہیں' جو جسم کی موت کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے۔ مثالیت پسند غیر فانی روح کو مانتے ہیں جو موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ مادیت کی رو سے تمام اخلاقی قدریں اضافی ہیں

1. Cause and Effect

اور ماحول کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ جب کہ مثالیت پسند انہیں ازلی و ابدی مانتے ہیں۔ مادیت پسند کہتے ہیں کہ کائنات کا صحیح علم ہمیں حواس ہی کے واسطے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مثالیت پسندوں کا دعویٰ ہے کہ حقیقی عالم کا ادراک صرف عقل استدلالی ہی کر سکتی ہے اور حواس کا عالم نظروں کا فریب ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر مادیت شروع ہی سے سائنس کے ساتھ اور مثالیت مذہب کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔

زینو قبرصی کے پیرو جنہیں رواقی[1] کہا جاتا ہے۔ مادیت پسند تھے اور کہتے تھے کہ کوئی غیر مادی شئے موجود نہیں ہو سکتی اور علم صرف حواس ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے حقیقت وہی ہے جسے ہم اپنے حواس کے وسیلے سے جانتے ہیں اور یہ حقیقت مادہ ہی ہے۔ ان کے خیال میں خدا اور روح بھی مادی ہیں۔ اس مادیت پر وحدت الوجود کا پیوند لگا کر انہوں نے کہا کہ خدا عالم کی روح ہے اور مادی عالم خدا کا جسم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات پر سلسلہ سبب و مسبب حاوی ہے لہٰذا انسان مجبور محض ہے۔ انہوں نے قدیم یونانی فلاسفہ کا یہ عقیدہ قبول کر لیا کہ کوئی شئے عدم سے وجود میں نہیں آ سکتی۔ ظاہر ہے کہ اس سے شخصی خدا کا انکار لازم آتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ کائنات ازلی و ابدی ہے اور اسے کسی نے خلق نہیں کیا۔ اپیکورس اور اس کے پیرو لکریشیس نے کامل مادیت کا ابلاغ کیا۔ اپیکورس کے خیال میں فلسفے کا مقصد انسان کو ان توہمات اور خدشات سے نجات دلانا ہے جو مذہب نے قدیم زمانے سے اس کے ذہن میں ڈال رکھے تھے' اس کے بقول دہشت کو دل سے نکال دو تمہیں خوشی مل جائے گی۔

اپیکورس نے دیماقریطس کا ایٹموں کا نظریہ قبول کر لیا اور کہا کہ روح بھی لطیف قسم کے ایٹموں سے مرکب ہے' جو موت کے بعد بکھر جاتے ہیں اور انسان فنا ہو جاتا ہے' وہ کہتا ہے کہ موت اور حیات بعد موت کی دہشت نے انسانی مسرت کے سرچشمے کو زہر آلود کر دیا ہے۔ جس شخص کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ میں موت کے بعد مٹ مٹا کر خاک میں مل جاؤں گا وہ دہشت سے نجات پا کر مسرت سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے۔ لکریشیس کی فلسفیانہ نظم "اشیاء کی ماہیت" مادیت کا ایک اہم صحیفہ ہے۔ اس میں لکریشیس نے بڑی تفصیل سے اپیکورس کا فلسفہ مادیت بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ:

1. Stoics

"مذہب نے انسان سے بڑے بڑے مظالم کا ارتکاب کرایا ہے۔"

جو لوگ فلسفہ و دانش کی تحصیل کے بجائے مذہبی رسوم کی ادائیگی کو ضروری سمجھتے ہیں' انہیں مخاطب کر کے کہتا ہے:

"بدبختو! مذہب نے تمہیں کیسے کیسے چرکے لگائے ہیں' ہمارے بچوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے ہیں۔ نیکی یہ نہیں کہ تم پتھروں کی قربان گاہوں پر سر جھکاؤ یا سجدے کرو' نیکی مذبحوں پر قربانی کا خون چھڑکنے میں بھی نہیں ہے بلکہ آسودہ اور شانت ذہن سے نیکی حاصل ہوتی ہے۔"

احیاء العلوم کی صدیوں میں گلیلیو' کوپرنیکس اور نیوٹن کے انکشافات کے ساتھ مادیت کو تقویت ہوئی اور سائنسدانوں نے مادی دنیا کو حقیقی مان کر اس کے قوانین دریافت کرنے پر کمر ہمت باندھی۔ یورپ کے دور جاہلیت میں اہل کلیسا نے علمی تحقیق و تجسس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ کیونکہ افلاطون کی پیروی میں وہ مادی دنیا کو فریب نظر سمجھ کر اس سے اعتنا نہیں کرتے تھے۔ سائنس کی اشاعت کو روکنے کے لیے جبر و تعدی سے کام لیا گیا۔ گلیلیو پر مقدمہ دائر کیا گیا اور وہ موت کی سزا سے بال بال بچا۔ کوپرنیکس کو اپنی تحقیق اپنی زندگی میں شائع کرنے کی جرأت نہ ہو سکی لیکن بالآخر سائنس ہی کی فتح ہوئی۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد نے تحقیق علوم کو گھر گھر پہنچا دیا۔ روجر بیکن اور فرانسس بیکن نے مشاہدے اور تجربے کی اہمیت واضح کی اور ہابس نے سائنس کے انکشافات کی روشنی میں فلسفے کو ازسرِ نو مرتب کیا۔ وہ نئے دور کا پہلا مادیت پسند فلسفی تھا۔

ٹامس ہابس (1588ء-1679ء) کی مادیت کا قائل تھا۔ اس کے خیال میں کائنات کی ہر شئے انسان سمیت مادی الاصل ہے اور حرکت کر رہی ہے۔ وہ حواس کے سوا کسی شئے کو علم کا ماخذ تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے فلسفے میں ذہن متحرک مادہ ہے اور فکر ترقی یافتہ حیات ہی کا ایک سلسلہ ہے۔ لکریشیس کی طرح وہ بھی کہتا ہے:

"غیر مرئی قوت کا خوف انفرادی صورت میں توہم ہے اور اجتماعی صورت میں مذہب ہے۔"

ہابس جبری تھا۔ اس کے خیال میں انسانی ارادے یا خواہش کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان مجبور محض ہے۔ ڈیکارٹ (1596ء-1650ء) بھی جدید طبیعیات

اور ہیئت سے متاثر ہوا تھا۔ وہ مادے...... اور ذہن کی دوئی کا قائل تھا۔ یہی دوئی اس کے فلسفے کا اصل اصول بن گئی۔ البتہ اس نے ذہن کو نیچر سے خارج کر دیا' جس سے طبیعیات کو فروغ ہوا۔ اس نے کہا کہ کائنات کی ہر شئے مقررہ قوانین کے تحت حرکت کرتی ہے۔ اس لیے ان قوانین کو سمجھ کر ہم کائنات کی قوتوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہم کائنات میں کسی نوع کے ذہن کو تلاش نہ کریں بلکہ کائنات کا مشاہدہ میکانکی انداز میں کریں۔ اس کے خیال میں سائنس کی دنیا سے ذہن روح اور مقاصد کو خارج کر دینا مناسب ہے اس کا مشہور مقولہ ہے...... "میں سوچتا ہوں' اس لیے میں ہوں"...... اس سے جدید فلسفے میں موضوعیت[1] نے بار پایا' جس کی تفصیل جرمن فلسفے کے حوالے سے آگے آئے گی۔

اٹھارویں صدی کو یورپ میں خرد افروزی کا دور کہا جاتا ہے۔ فرانس کے قاموسی فلاسفہ' دیدرو' والٹیر وغیرہ نے اسے پروان چڑھایا تھا' یہ وہ زمانہ تھا جب جدید سائنس کی اشاعت کے ساتھ ہر کہیں عقلیت کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ عقلیت کے ساتھ قاموسی فلاسفہ جمہوریت اور انسان دوستی پر عقیدہ رکھتے تھے اور دین فروشوں پادریوں کی ریاکاری کے مخالف تھے۔ انہوں نے الہام کے وسیلے کے بغیر سائنس کی بنیاد پر ایک نیا مذہب جاری کیا' جسے انہوں نے یزدانیت کا نام دیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ایک نہ ایک دن انسان سائنس کی روشنی میں ترقی کی منازل طے کر کے منصفانہ معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ قاموسی فلاسفہ سائنس ہی کی بنیادوں پر نئی تہذیب کی تشکیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ انسان کو فطرتاً نیک مانتے تھے اور اس کی ترقی پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔ ہم ان کی اشتمالیت پسندی کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں ان کی مادیت کے بارے میں مختصراً بات کریں گے۔

قاموسی فلاسفہ نے ڈیکارٹ کے اس نظریے کو کہ حیوانات خود کار کلیں ہیں' انسان پر منطبق کر دیا' اور اسے بھی جسم اور روح سمیت ایک کل قرار دیا۔ اگرچہ یہ کل زیادہ پیچیدہ اور مضحکہ خیز ہے۔ ان کے خیال میں طبیعیات اور کیمسٹری کے قوانین ذی حیات پر بھی اسی طرح حاوی ہیں جیسے کہ غیر ذی حیات پر لاگو ہوتے ہیں۔ لامتری لکھتا ہے کہ انسان کے ذہن و قلب کے تمام واردات مادی نوعیت کے ہیں۔ دولباخ نے روح کے وجود سے انکار کیا ہے اور کہا کہ ذہن بھی مغزِ سر کا ایک ایسا ہی فعل ہے' جیسا کہ ہضم معدے کا فعل ہے'

1. Subjectivism

کائنات میں صرف مادہ غیر فانی ہے اور نیچر میں کسی نوع کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ نیچر کی کل چند اٹل قوانین کے تحت چل رہی ہے۔ قاموسی فلاسفہ جبریت کے قائل تھے۔ کیوں کہ سبب ومسبب کا قانون ہر شئے پر حاوی ہے۔ ویدرو اور بوفے نے ارتقاء کا تصور پیش کیا اور ڈاروِن کی پیش قیاسی کی۔ قاموسی کہتے تھے کہ کائنات ایک خودکار نظام ہے۔ جس میں ہر قسم کا تغیر وتبدل چند طبیعی قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ انہوں نے سائنس کے طرز تحقیق پر زور دیتے ہوئے کہا کہ حقائق کا مشاہدہ بہر صورت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر عملی تحقیق کے کام کو آگے بڑھایا نہیں جاسکتا۔

کانٹ نے عہد خرد افروزی کے قاموسی فلاسفہ کے رد میں قلم اٹھایا۔ اس کی ذات سے جرمنوں کی فلسفیانہ رومانیت کا آغاز ہوا۔ فشٹے، نشٹے اور لائسے اس رومانی تحریک کی پیداوار تھے۔ کانٹ نے قاموسی فلاسفہ کی مادیت کے خلاف قلم اٹھایا اور یونانی مثالیت پسندوں کی طرح کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کیا: ظاہری عالم اور باطنی عالم۔ وہ کہتا ہے کہ باطنی عالم ہی حقیقی ہے جسے ہم عقلی استدلال اور سائنسی تحقیق سے نہیں جان سکتے۔ سائنس کا تعلق ظاہری عالم سے ہے اور مذہب حقیقی عالم سے واسطہ رکھتا ہے۔ کانٹ کے فلسفے سے دو تحریکوں کا آغاز ہوا۔

(1) عقلیاتی مثالیت جس کی رو سے خود شعور ذہن ہی اصل حقیقت ہے (فشٹے، شیلنگ، ہیگل)۔

(2) ارادیت جس کے مطابق کائنات پر ایک اندھا ارادہ مسلط ہے۔ ارادیت کا سب سے مشہور شارح شوپنہائر تھا۔

فشٹے، لاتسے اور ہیگل نے کہا کہ صرف ذہن ہی موجود ہے اور یہی عالم مادی کا خالق ہے۔ اس طرح مثالیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ یاد رہے کہ جارج بارکلے نے بھی مادے کے وجود سے انکار کیا تھا۔ اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ مادی اشیاء صرف ذہن ہی میں موجود ہو سکتی ہیں کیونکہ ان کے موجود ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں کوئی نہ کوئی ذہن ادراک[1] کر رہا ہو۔ جب اس سے کہا گیا کہ انسان کے صفحہ ہستی پر نمودار ہونے سے پہلے بھی تو مادی اشیاء موجود تھیں تو اس نے جواب دیا کہ ہاں خدا کے ذہن میں موجود تھیں۔ اس بات کا ذہن

1. Perceive

نشین کر لینا ضروری ہے کہ مثالیت پسند شروع ہی سے ذہن کو مادے پر مقدم مانتے رہے ہیں اور مادے کو ذہن کی تخلیق قرار دیتے ہیں' جب کہ مادیت پسندوں کے خیال میں مادہ ذہن پر مقدم ہے اور ذہن مادے ہی سے نکلا ہے۔ فشٹے پر طنز کرتے ہوئے مادام وسٹیل نے کہا تھا:

"اس بات میں تو فشٹے کو بھی شک ہوگا کہ اس کی بیوی محض اس کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔"

19ویں صدی میں طبیعی سائنس کے فروغ سے میکانکی یا نیچری نقطۂ نظر کا رواج و قبول ہوا۔ چارلس ڈارون اور ارنسٹ ہیکل اس کے مشہور ترجمان تھے۔ ان کے خیال میں نیچر وہ ہے' جس کا ادراک ہم اپنے حواسِ خمسہ سے کرتے ہیں۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء میں ذی حیات پر بھی طبیعی قوانین کا اطلاق کیا گیا ہے اور اس کی روشنی میں اصولِ ارتقاء کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے' ہیکل کہتا ہے کہ ذہن جسم سے علیحدہ نہیں ہے بلکہ مغز سر ہی کا فعل ہے۔ اس کے خیال میں نیچر کو سائنس کے طرزِ تحقیق ہی سے جانا جا سکتا ہے اور عالم طبیعی کی توجیہہ کے لیے کسی ماورائی ذہن و شعور سے رجوع لانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ذہن نیچر ہی سے نکلا ہے۔ لہٰذا جو قوانین ستاروں پر حاوی ہیں۔ وہی انسان پر بھی متصرف ہیں۔

جدید طبیعیات کے انکشافات کے باعث مادے کا پرانا ٹھوس ہونے کا تصور باقی نہیں رہا اور وہ الیکٹران' پروٹون اور نیوٹران کے اجزاء میں تحلیل ہو گیا ہے۔ جس سے مادے اور توانائی کے متبادل ہونے کا ثبوت ملا ہے لیکن جیسا کہ بعض مثالیت پسند اور اہلِ مذہب کہہ رہے ہیں مادہ "غائب" نہیں ہوا' اس کی معروضی حیثیت برقرار ہے اور وہ انسانی شعور سے آزاد مستقل صورت میں موجود ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ مادیت سائنسی اور مثالیت مذہب سے وابستہ رہی ہے۔ اہلِ مغرب ازلی ابدی اخلاقی قدروں' ظاہری عالم اور باطنی عالم کی تفریق اور روح کی بقا سے اپنے عقائد کی توثیق کرتے رہے ہیں۔ مثالیت پسند فلاسفہ نے جا بجا عین مطلق یا وجودِ مطلق کو خدا کہا ہے' وہ بے شک شخصی خدا پر عقیدہ نہیں رکھتے لیکن لفظ خدا کے استعمال سے ان کا ناطہ مذہب سے بحال رہا ہے۔ علاوہ ازیں مثالیت پسند روح کی بقا اور حیات بعد موت کے بھی قائل رہے ہیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر ولی آگسٹائن نے افلاطون کو "فلسفیوں کا

مسیح'' کہا تھا۔ آج بھی اہلِ مذہب افلاطون، کانٹ، شلائر ماخر، لاتسے، برگساں، بشپ بارکلے، ایوکن وغیرہ مثالیت پسندوں کے افکار سے اپنے عقائد کے اثبات کا کام لے رہے ہیں۔

مادیت کا رابطہ سائنس سے برقرار رہا ہے۔ مادیت پسند مادی عالم کو حقیقی اور ازلی وابدی مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے کسی دیوتا یا خداوند خدا نے خلق نہیں کیا بلکہ چند قوانین کائنات پر متصرف ہیں وہ مثالیت پسندوں اور اہل مذہب کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کرتے کہ کائنات کو کسی باشعور ہستی نے تخلیق کیا ہے۔ کیونکہ ان کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ مادہ اپنی ذات میں موجود ہے اور اپنے وجود کے لیے کسی ذہن کا محتاج نہیں ہے۔ ان کے خیال میں مادہ ذہن سے نہیں نکلا بلکہ ذہن مادے سے نکلا ہے۔ وہ روح کے وجود اور حیات بعد موت کے بھی منکر ہیں اور ازلی و ابدی صداقتوں یا قدروں کے بھی قائل نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ اخلاقی قدریں اضافی ہوتی ہیں یعنی طبیعی معاشرتی ماحول کے بدلنے کے ساتھ بدل جاتی ہیں۔ مادیت پسند اور سائنسدان جبری ہیں کیونکہ ان کے خیال میں انسان قوانینِ قدرت کی پابندی پر مجبور ہے البتہ اس جبر کی حدود میں رہ کر وہ ان سے حسب منشا کام لینے پر قدرت رکھتا ہے۔ ہمارے دور کے اکثر فلاسفہ نے مابعد الطبیعیات کو فلسفے سے خارج کر دیا ہے جس سے مثالیت کی بنیاد منہدم ہو گئی ہے۔ اب سائنس اور فلسفہ ایک دوسرے کے قریب تر آ گئے ہیں۔

اشتمالیت اور مادیت کا گہرا ربط قابلِ فہم ہے۔ مثالیت پسند مادی عالم کو غیر حقیقی اور اعتباری سمجھتے رہے ہیں۔ اسے کسی ماورائی عالم کا سایہ مانتے رہے ہیں۔ اس لیے قدرتاً انہوں نے معاشرے یا ماحول کو بدلنے کی کوئی تعمیری اور مثبت کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس مادیت پسند عالم مادی کو حقیقی سمجھتے ہیں۔ اس لیے اس میں گہری دلچسپی لیتے ہیں اور اس دلچسپی کے باعث سائنس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور سائنسدانوں نے نئے نئے انکشافات کیے ہیں اور اسی دلچسپی کے باعث مادیت پسند معاشرے کو بدلنے کی کوشش بھی کرتے رہے ہیں۔ اشتمالیت اسی جدوجہد کا ثمرہ ہے بعض مثالیت پسندوں نے بے شک اشتمالیت ہی کو مثالی نظام قرار دیا تھا لیکن ان کا یہ تصور اٹوپیائی اور ماورائی تھا کیونکہ ان کا ذہنی اور فکری رشتہ عالمِ مادی کے ٹھوس حقائق سے منقطع ہو چکا تھا۔ اس اٹوپیا کو حقیقت میں بدل دینے کا کارنامہ جدلیاتی مادیت پسندوں نے انجام دیا۔

کارل مارکس

کارل مارکس کی 5 رمئی 1818ء کو جرمنی کے ایک شہر ٹریر میں ایک قانون دان یہودی ہائزخ مارکس کے گھر پیدا ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد کئی پشتوں سے ربائی چلے آ رہے تھے لیکن ہائزخ نے مصلحتاً عیسائیت قبول کر لی تا کہ وہ فرقہ وارانہ تعدی سے محفوظ رہ سکے۔ کارل مارکس بچپن ہی سے نہایت ذہین تھا۔ اس نے 1835ء میں میٹرک کا امتحان دیا' جس میں اس نے ''پیشے کے انتخاب کے بارے میں ایک نوجوان کے خیالات'' کے عنوان سے مضمون لکھا اس میں کہا:

> ''پیشے کے انتخاب میں ہمارے لیے فیصلہ کن محرک یہ ہونا چاہیے کہ اپنی ذات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ہم بنی نوع انسان کی بہبود کا کام بھی کریں...... انسانی فطرت ایسی واقعہ ہوئی ہے کہ آدمی دوسروں کی بہتری کے لیے کام کر کے ہی اپنی ذات کی تکمیل کر سکتا ہے۔''

1836ء کو کارل مارکس کی منگنی اس کی بچپن کی ہم جولی جینی سے ہوگئی جو اس کی بڑی بہن صوفیہ کی سہیلی تھی اور امراء کے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ جینی کا باپ جوہان لڈوگ فان وسٹ فالن پروشیا کا پریوی کونسلر تھا اور سکاٹ لینڈ کے روساء کے مشہور خانوادے ارگل کیمبل کا ایک فرد تھا۔ کارل مارکس کا باپ اس منگنی کے بارے میں متردد تھا اور محسوس کرتا تھا کہ جینی جیسی رئیس زادی نے جو اپنے حسن و جمال اور تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے شہر بھر کی لڑکیوں میں ممتاز تھی۔ کارل مارکس سے منگنی کر کے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے۔ وہ جینی کے مضبوط کردار سے بڑا متاثر ہوا اور اسے ایثار اور بے نفسی کا پیکر سمجھنے لگا۔ اس کے ساتھ وہ اپنے بیٹے کی چٹان جیسی محکم شخصیت سے بھی بے خبر نہیں تھا۔ وہ کہا کرتا تھا

کہ میرے بیٹے کے سینے میں ایک "دیو" چھپا بیٹھا ہے کیا معلوم یہ کیا رنگ لائے گا۔

کارل مارکس برلن یونیورسٹی میں طالب علمی کے دوران شعر کہا کرتا تھا۔ اس نے عشقیہ نظموں سے بھری ہوئی تین بیاضیں جینی کو پیش کیں۔ بعد میں ان نظموں کا ذکر کرتے ہوئے کارل مارکس کہا کرتا تھا کہ ان میں جذبے کی حرارت تو موجود تھی لیکن تھیں وہ بے تکی ہی۔ ہائرخ کو اپنے بیٹے کی شعر گوئی کا علم ہوا تو اسے یہ بات ناگوار گذری۔ اس نے کارل کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ذہنی و جذباتی اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ کارل کی دو رومانوی نظمیں ایک ادبی جریدے اتھینام میں شائع ہوئی تھیں۔ یونیورسٹی میں کارل نے فلسفہ' تاریخ اور قانون کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں وہ ہیگل کے مداحوں میں شامل تھا۔ اس کے دو ہم خیال ساتھیوں ایڈگر باﺅر اور کارل کوپن نے خاصی شہرت پائی۔ کارل مطالعے میں غرق رہتا تھا اور کتابوں سے اقتباسات لیا کرتا تھا۔ یہ عادت عمر بھر باقی رہی اس نے ڈاکٹریٹ کے لیے ایپکورس پر مقالہ لکھا' جس سے وہ مادیت کی جانب مائل ہو گیا اور ہیگل کی مثالیت سے بدظن ہو گیا' جب اسے ڈاکٹریٹ کی سند ملی تو معروف ناول نگار برتھولڈ آﺅرباخ نے اپنے 23 سالہ دوست کے بارے میں موزس ہوس کو خط میں لکھا:

> "اس دور کا عظیم ترین اور واحد حقیقی فلسفی ڈاکٹر مارکس ابھی جوان ہے' اس کے ہاتھوں سے ازمنہ وسطیٰ کے مذہب اور فرسودہ سیاسیات کا خاتمہ ہو گا۔ مارکس بے حد ذہین ہے اور فلسفیانہ متانت سے بھی بہرہ ور ہے۔ اس کی ذات میں روسو' والٹیر' ہولباخ' لسنگ' ہائنے اور ہیگل اکٹھے ہو گئے ہیں۔"

مارکس کے حلقہ احباب میں لڈوگ فوئرباخ بھی شامل تھا جس نے بعد میں ہیگل کی مثالیت پر نقد لکھ کر اسے تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا اور اپنی مادیت سے کارل مارکس کو بھی متاثر کیا تھا چنانچہ آج جدلیاتی مادیت کے ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے فوئرباخ کو ہیگل اور کارل مارکس کے درمیان ایک ضروری واسطہ سمجھا جاتا ہے۔ کارل مارکس پروفیسر بننے کا آرزومند تھا لیکن وہ اس انقلابی تحریک کی لپیٹ میں آ گیا جو شاہ فریڈرک ولیم سوم کی موت کے بعد جرمنی میں شروع ہوئی اور شدہ شدہ سارے یورپ میں پھیل گئی۔ کارل مارکس جاگیرداری نظام کا مخالف تھا' جس کے باعث کسان صدیوں سے اپنے ابتدائی انسانی

حقوق سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ اپنے انقلابی افکار کی اشاعت کے لیے اس نے ایک جریدے رینش زائی ٹنگ میں پُر مغز اور زوردار مقالات لکھے' جن سے اس کی جودتِ فکر اور علمیت کی ہر کہیں دھاک بیٹھ گئی۔ 1843ء میں حکومت نے یہ پرچہ بند کر دیا۔ انہی ایام میں کارل مارکس کو اپنے والد سے ایک معقول رقم ملی' جس سے اس نے اپنا چھاپہ خانہ نصب کر لیا اور ایک نیا پرچہ نیو رینشن زائی تنگ کے نام سے جاری کیا لیکن حکومت نے اس کی اشاعت پر بھی پابندی لگا دی اور مارکس کو نہایت پریشانی کے عالم میں ہجرت کرنی پڑی' جس سے اس کا سارا اثاثہ دریا بُرد ہو گیا۔ اس پُر آشوب دور میں اسے جرمنی' پیرس اور بیلجیم سے بار بار جلاوطن کیا گیا۔ اس دربدری میں اس کی باوفا بیوی جینی نے اس کی رفاقت کا حق ادا کیا۔ برسلز میں پولیس نے کارل مارکس کو گرفتار کر لیا۔ جینی اس کی خبر لینے پولیس اسٹیشن گئی تو اسے بھی حوالات میں بند کر دیا گیا اور قیدی کسبیوں کی کوٹھری میں رکھا گیا۔ بعد میں وہ رہا ہو کر اپنے شوہر سے جا ملی۔ کارل مارکس کی اینجلز سے پہلی ملاقات پیرس میں ہوئی جو عمر بھر کی گہری دوستی کا عنوان بن گئی۔ اس کے بعد دونوں دوست مل کر کام کرنے لگے اور عزم و ہمت سے انقلابی تنظیم کے کام میں محو ہو گئے۔

فریڈرک انجلز 28 نومبر 1830ء کو جرمنی کے ایک شہر بارمن میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک خوشحال صنعت کار تھا۔ تعلیم کے دوران انجلز بھی مارکس کی طرح شعر کہا کرتا تھا۔ فارغ التحصیل ہو کر انجلز کاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگا لیکن جلد ہی انقلابی سرگرمیوں کے چکر میں آ گیا' جس سے اس کے باپ کو سخت مایوسی ہوئی۔ انقلابیوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی لیکن بیڈن کی لڑائی میں شاہی فوج نے انہیں شکست دی۔ انجلز نے بھی جو فنِ حرب کا تربیت یافتہ تھا اس لڑائی میں حصہ لیا۔ شکست کے بعد وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور انگلستان چلا گیا' جہاں مانچسٹر میں اس کے باپ کا ایک کارخانہ تھا۔ مانچسٹر میں دورانِ قیام انجلز نے انگریزی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی زبوں حالی کا جائزہ لیا اور اپنی کتاب ''انگلستان کے مزدور طبقے کے احوال'' میں اس کی تفصیل بیان کی جس سے پہلی بار لوگ مزدور طبقے کے مسائل سے آگاہ ہوئے۔ انجلز مارکس کی طرح پکا مادیت پسند اور پُرجوش انقلابی تھا۔ وہ نہایت فراخ دلی سے تاریخی مادیت کے نظریئے کی اولیت اور معاشرہ انسانی کی جدلیاتی ارتقاء کے تصور کو کارل مارکس

سے منسوب کرتا تھا لیکن اس کی اپنی فکری و علمی دین بھی گرانقدر ہے۔ ریاست کی ابتداء کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ریاست اس وقت عالمِ وجود میں آئی جب معاشرہ انسانی طبقات میں بٹ گیا۔ غالب طبقے نے مغلوب طبقے پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے ریاست قائم کی تھی۔ وہ لکھتا ہے: [1]

"قدیم زمانے کی ریاست کسانوں اور مزارعوں کی ریاست تھی' جس کا مقصد غلاموں کو محکوم رکھنا تھا۔ جاگیرداروں کی ریاست کسانوں اور مزارعوں کو دبائے رکھنے کے لیے آلہ کار ثابت ہوئی۔ جدید نمائندہ یا پارلیمانی ریاست سرمایہ داروں کا ایک وسیلہ بن گئی جس سے وہ محنت کشوں کو لوٹ رہے ہیں۔"

انجلز کا عقیدہ تھا کہ محض زبانی کلامی وعدوں سے محنت کشوں کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا' اور سرمایہ داروں کے جبر و استحصال سے نجات پانے کے لیے محنت کشوں کو مسلح جدوجہد کرنی ہوگی۔

جب یورپ میں کارل مارکس کو کہیں پناہ نہ ملی تو وہ لندن چلا گیا۔ 1848ء میں کارل مارکس اور انجلز نے اپنا مشہور انقلابی منشور شائع کیا' جس میں دنیا بھر کے محنت کشوں کو متحد ہو کر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف جدوجہد کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے کمیونسٹ لیگ کا پرانا نعرہ "سب انسان بھائی بھائی ہیں" بدل کر ایک نیا نعرہ جو بین الاقوامی پرولتاریہ کا نعرہ بن گیا:

"دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ۔"

لوئی انٹر میئر انقلابی منشور کے بارے میں لکھتا ہے: [2]

"انقلابی منشور کا لب لباب یہ ہے کہ تاریخی مادیت میں ذرائع پیداوار کی ملکیت اہم ہے۔ طبقاتِ معاشرہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کون سا طبقہ ذرائع پیداوار کا مالک ہے اور کون سا نہیں۔ ظاہراً جو طبقہ ذرائع پیداوار کا مالک ہے۔ وہی دوسرے طبقے کا استحصال کرتا ہے۔ لہٰذا محروم

---

1. The origin of family private property and the state
2. Maker's of the modern world

طبقہ جدوجہد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تاریخ عالم قدیم اشتمالیت سے لے کر سرمایہ داری نظام تک اسی طبقاتی آویزش سے عبارت ہے۔ ذرائع پیداوار کے مالک طبقے کے خلاف مخالفت اور منافرت بڑھ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ان تضادات کے باعث جو اس کے ضمیر میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مارکس جب سوشلزم کے ناگزیر ہونے کا ذکر کرتا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ سرمایہ داروں کا ظلم محنت کشوں کو ان کا قلع قمع کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

اٹوپیائی سچے انسان دوست تھے اور شخصی املاک کو تمام معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کی جڑ سمجھتے تھے لیکن طبقاتی آویزش میں وہ پرولتاریہ کے تاریخی کردار سے بے خبر رہے۔ اس لیے انقلابی تحریکوں کی عملاً آبیاری نہ کر سکے۔ کارل مارکس اور انجلز نے منصفانہ معاشرہ تعمیر کرنے کے لیے عملی تجاویز پیش کیں جو معاشرے کے معروضی احوال پر مبنی تھیں اس لیے وہ اشتمالی انقلاب کے لیے راہ ہموار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرانس کے خردمند قاموسیوں کی طرح کارل مارکس کا بھی یہی خیال تھا کہ عقل و خرد معاشرے کی ارتقاء میں اسی صورت میں موثر ہو سکتی ہے جب وہ نیچر اور معاشرے کے معروضی قوانین سے مطابقت رکھتی ہو۔

لندن میں کارل مارکس کو بے پناہ مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی تفصیل اس کے اور جینی کے خطوط سے ملتی ہے۔ یہ داستان اندوہناک بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی۔ وجہ معاش کے لیے کارل مارکس نے ایک امریکی جریدے کے لئے لکھنا شروع کیا جس کا معاوضہ اسے ایک پونڈ فی مقالہ ملتا تھا۔ اخبار والے اس کے مضامین سے جملے اڑا کر اپنے مقالہ افتتاحیہ میں شامل کر لیتے تھے اور بچا کھچا مواد مارکس کے نام سے چھاپ دیتے تھے۔ جاڑے میں کوئلے اور خوراک کی فراہمی میں مشکل پیش آتی تھی۔ کئی دفعہ مارکس کو نان شبینہ کے لیے اپنے کپڑے گروی رکھنا پڑے اور وہ کئی روز گھر میں گھسا بیٹھا رہا۔ وہ اپنی بیٹیوں کو سکول میں داخلہ نہ دلا سکا۔ وہ گھر کی چار دیواری میں مقید ہو گئیں کیونکہ ان کے جوتے گروی رکھ دیئے جاتے تھے۔ ان حالات میں جینی اپنے قیمتی ملبوسات' زیور اور برتن گروی رکھ کر یا بیچ کر ان غریب الوطن انقلابیوں کے لیے نان و نفقہ کا انتظام کرتی رہی' جو یورپ

کی انقلابی تحریکوں کی ناکامی کے بعد بھاگ کر لندن میں پناہ لے رہے تھے۔ جینی کو جہیز میں جو بھاری چاندی کے برتن ملے تھے ان پر آرگل خانوادے کا نشان کندہ کیا گیا تھا۔ ایک دن کارل مارکس یہ برتن گروی رکھنے کے لیے بازار گیا۔ دکاندار نے آرگل خانوادے کا نشان دیکھا اور پھر کارل مارکس کی ہیئت کذائی پر نظر کی تو اسے شبہ ہوا کہ یہ چوری کا مال ہے۔ کارل مارکس نے بڑی مشکل سے اس کی تشفی کی اور اپنی جان چھڑائی۔ مارکس کو شب و روز مکان کا کرایہ' بچوں کی فیس اور قرضوں پر سود ادا کرنے کی پریشانیاں لاحق رہتی تھیں۔ ایک دفعہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے گھبرا کر مارکس نے سوچا کہ وہ اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دے اور بڑی بیٹیوں کو کسی گھرانے میں گورنس کی ملازمت دلا دے لیکن انجلز نے اسے اس ارادے سے باز رکھا اور مالی امداد دے کر قرض خواہوں سے اس کا پیچھا چھڑایا۔ کارل مارکس نے اپنی ماں سے التجا کی کہ وہ اپنے آبائی ورثے کا حصہ اسے دے لیکن اس نیک بخت کا جی نہ پسیجا اور کہا تو یہ کہا کہ

"سرمائے کی مخالفت کرنے کی بجائے تمہیں سرمایہ کمانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی"۔

ایک فرانسیسی انقلابی نے جو میڈیکل سکول کا طالب علم تھا' مارکس کی بیٹی لارا سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مارکس نے اس بات کا ذکر انجلز سے کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس طالب علم کی مالی حالت کا اطمینان کیے بغیر لارا کو اس سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ ناز پروردہ جینی نے اس سے شادی کر کے بہت دکھ جھیلے تھے۔ ایک خط میں لکھتا ہے:

"تم جانتے ہو میں نے اپنا سب کچھ انقلابی جدوجہد پر قربان کر دیا ہے۔ مجھے اس بات کا افسوس نہیں ہے۔ اگر مجھے دوبارہ زندگی شروع کرنے کا موقع ملے تو بھی میں یہی کچھ کروں گا۔ اتنا ضرور ہے اس صورت میں شادی نہیں کروں گا۔ جہاں تک میرے بس میں ہے' اپنی بیٹی کو اس کھڈ میں گرنے سے بچاؤں گا جس میں گر کر اس کی ماں پاش پاش ہو چکی ہے۔"

یہ وہ زمانہ ہے' جب کارل مارکس کے قرض خواہ اسے عدالت میں گھسیٹنے کا جتن کر رہے تھے۔ مارکس نے اپنا اوور کوٹ اور دوسرے بھاری کپڑے گروی رکھ کر اپنی بیٹی کی منگنی

کی رسم ادا کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ہونے والے شوہر پر اس کی تنگ دستی اور زبوں حالی کا راز کھل جائے۔ انہی ایام میں اس کی بڑی بیٹی نے سکاٹ لینڈ کے ایک خاندان کی بچیوں کو پڑھانا شروع کیا تا کہ وہ اپنے کنبے کی تھوڑی بہت کفالت کر سکے۔ جب قصاب نے انہیں گوشت ادھار دینے سے انکار کر دیا تو مارکس اور اس کے بیوی بچے روکھی سوکھی کھا کر گذر بسر کرنے لگے۔ اس کسمپرسی اور افلاس کے عالم میں اسے اور اس کے بیوی بچوں کو امراض نے گھیر لیا۔ علاج کے لیے گھر میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ اسی حالت میں اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی داغ مفارقت دے گئے۔ اس کے آٹھ سالہ بیٹے ایڈگر کی حالت بگڑ گئی تو مارکس رات بھر اس کے ساتھ لیٹ کر اس کی تیمارداری کرتا رہا۔ ایڈگر کی موت نے گویا اس تاریک غمکدے کی شمع گل کر دی اور میاں بیوی اس صدمے سے نڈھال ہو گئے۔ مارکس ایک خط میں لسال کو لکھتا ہے:

''بیکن کہتا ہے کہ ممتاز لوگوں کے دنیا سے اتنے رشتے ناطے ہوتے ہیں اور اتنی دلچسپیاں ہوتی ہیں کہ وہ کسی بھی نقصان کو آسانی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ میں اس زمرے سے نہیں ہوں۔ اپنے پیارے بیٹے کی موت نے مجھے ذہنی طور پر جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔''

جینی بیمار پڑ گئی تو انجلو کو خط میں لکھا:

''میری بیوی ذہنی پریشانیوں کے باعث ایک ہفتے سے بیمار ہے۔ میرا دل خون ہو چکا ہے اور کھوپڑی میں آگ بھڑک رہی ہے لیکن مجھے دکھاوے کے لیے پرسکون رہنا پڑتا ہے۔''

جینی بھی اپنے شوہر کے بارے میں پریشان رہتی تھی' جوزف ویڈمیئر کو ایک خط میں لکھتی ہے:

''میرے شوہر کو بورژوا زندگی کی چھوٹی موٹی پریشانیوں نے نیم جان کر دیا ہے اور اسے ایسے وقت میں آن گھیرا ہے جب اسے اپنی تمام توانائی' سکون اور اعتماد نفس کی ضرورت تھی۔''

جوزف ویڈمیئر ہی کو ایک اور خط میں لکھتی ہے:

''یہ مت خیال کرنا کہ میں ان پریشانیوں کے آگے جھک جاؤں

گی۔ میں جانتی ہوں کہ ہماری کشمکش کچھ ہمارے ساتھ خاص نہیں ہے' مجھے
اس بات سے دلی خوشی ہے کہ میرا پیارا شوہر میری زندگی کا سہارا میرے
ساتھ ہے۔ اس بات سے البتہ دکھ ہوتا ہے کہ اسے معمول کی پریشانیوں کا
سامنا کرنا پڑا اور اس کی امداد کا کچھ بھی سامان نہ ہو سکا۔ وہ جو دوسروں کی
مدد کرنے میں دلی خوشی محسوس کرتا ہے' اب خود محتاج ہو گیا ہے۔"

لسال کو لکھا:

"مارکس کو اس بات کی فکر کھائے جا رہی ہے کہ وہ اپنے کام جلدی
سے سرانجام نہیں دے سکا۔ اس کے ساتھ اسے ذہنی سکون بھی میسر نہیں ہے'
جس سے اس کی صحت گر گئی ہے اور نان شبینہ کے حصول کی تگ و دو نے
اسے نڈھال کر دیا ہے۔ جس سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔"

یہی فکر کارل مارکس کو لاحق تھی' اس نے انجلو کو لکھا:

"گذشتہ آٹھ ہفتوں سے پریشانیوں کی جس دلدل میں پھنس گیا
ہوں' میں نہیں چاہتا کہ میرے بدترین دشمن بھی اس آشوب سے گذریں۔
مجھے سب سے زیادہ اس بات کا قلق ہے کہ میرے ذہنی قویٰ متاثر ہو رہے
ہیں اور میرے کام کرنے کی صلاحیت برباد ہو رہی ہے۔"

اسی زمانے میں کارل مارکس کو خبر ہوئی کہ اس کا دیرینہ انقلابی رفیق کارل شاپر
بسترِ مرگ پر پڑا اسے یاد کر رہا ہے' کارل مارکس اسے ملنے گیا تو کارل شاپر نے کہا:

"ہمارے ساتھیوں کو معلوم ہے کہ میں اپنے اصولوں پر کار پابند رہا
ہوں۔ اگرچہ رجعت پسندی کے اس دور میں مجھے اپنے کنبے کی کفالت کے
لیے کٹھن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے ایک محنت کش کی زندگی
گذاری اور ایک محنت کش ہی کی موت مر رہا ہوں۔"

کارل مارکس کو قدرتاً اپنے دوست کی موت پر رنج ہوا لیکن اس خیال سے اسے
تقویت قلب بھی ہوئی کہ انقلابی جدوجہد میں دوسرے بھی اس کے ساتھ قربانیاں دینے
میں شریک ہیں۔ اس دوران میں کارل مارکس کو کرائے کے مکان سے بے دخل کر کے اس
کا سامان قرق کر لیا گیا۔ جینی ایک خط میں لکھتی ہے کہ:

"1850ء کے موسمِ بہار میں ہمیں چیلسی والا مکان چھوڑنا پڑا۔ میرا بچہ فاکس بیچارہ بیمار تھا' روزمرہ پریشانیوں کے باعث میری صحت بگڑ گئی۔ ہم چاروں طرف سے مصائب میں گھرے ہوئے تھے۔ قرض خواہ ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ ایک ہفتے تک ہم ایک جرمن ہوٹل میں ٹھہرے رہے یہاں کا قیام بھی مختصر ثابت ہوا۔ ایک صبح ہوٹل والے نے ہمیں ناشتہ دینے سے انکار کر دیا اور ہمیں نئے ٹھکانے کی تلاش ہوئی' میری ماں جو تھوڑی بہت امداد کرتی تھی اس نے ہمیں فاقوں سے بچائے رکھا۔ آخر ہمیں ایک یہودی فیتہ فروش کے مکان میں دو کمرے مل گئے جہاں ہم نے گرما کا موسم بڑی تکلیف میں گذارا۔"

اس افراتفری کے دوران میں ان کا ننھا بیٹا گائیڈو مختصر علالت کے بعد دم توڑ گیا اور ننھی فرانزسکا کا بھی یہی حشر ہوا۔ جینی اس کی موت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے:

"1852ء کے ایسٹر پر ہماری ننھی فرانزسکا شدید نزلے میں مبتلا ہوگئی۔ تین دن رات وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں سسکتی رہی۔ اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی جب اس نے آنکھیں موند لیں تو ہم نے اس کی ننھی سی نعش کو عقبی کمرے میں رکھا اور سامنے کے کمرے میں فرش پر ہم سب نے بستر بچھائے تینوں بچے ہمارے ساتھ لیٹ گئے ہم سب اس ننھے فرشتے کے لیے رو رہے تھے جس کا بے جان جسم پچھلے کمرے میں پڑا تھا۔ بیچاری ننھی کی موت ایسی حالت میں ہوئی جب ہم فاقے کاٹ رہے تھے ہمارے جرمن دوست بھی ہماری کچھ مدد نہ کر سکے۔ ارنسٹ جونز نے جو ہمارے یہاں آیا کرتا تھا امداد کا وعدہ کیا لیکن کچھ بھی فراہم نہ کر سکا۔ میں اپنے دل میں درد کی دنیا لیے ایک فرانسیسی پناہ گزین کے ہاں گئی جو ہمارے پڑوس میں رہتا تھا اور ہمارے یہاں آیا جایا کرتا تھا' میں نے اسے اپنی بپتا کہہ سنائی اور مدد مانگی۔ اس جوانمرد نے نہایت دلسوزی سے مجھے دو پونڈ دیئے۔ اس رقم سے ہم نے اس تابوت کا سامان کیا' جس میں ہماری بچی ابدی نیند سو رہی ہے' جب وہ پیدا ہوئی تو اس کے لیے گہوارہ نہ مل سکا اور

اب اس کے تابوت کے لیے کیا کچھ نہ کرنا پڑا۔ لوگ اس کی نعش اٹھائے
قبرستان کو چلے تو ہمارے دلوں پر کیا کیا عالم گذر گئے۔"

ان کٹھن حالات میں مارکس اور جینی بھی مزمن امراض میں مبتلا ہو گئے۔ سرطان جینی کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اور کارل مارکس کے پھیپھڑے ماؤف ہو گئے۔ کارل مارکس گٹھے ہوئے جسم کا تنومند آدمی تھا لیکن مسلسل پریشانیوں، فاقہ زدگی اور ذہنی کاوش نے اس کی صحت تباہ کر دی۔ اس کے باوجود اس نے ثابت قدمی سے اپنا کام جاری رکھا۔ جب وہ مطالعے اور تصنیف و تالیف سے فارغ ہوتا تو انقلابی سرگرمیوں میں جت جاتا۔ اسے اپنے نصب العین اور محنت کشوں کے روشن مستقبل پر پورا اعتماد تھا۔ اس کی بڑی بیٹی جینی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو مارکس نے اسے مبارکباد کا خط لکھتے ہوئے کہا کہ آج کل کے پیدا ہونے والے بچوں کے سامنے ایسا انقلابی عہد ہے جس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔

"بوڑھا ہونا اچھا نہیں ہے کیونکہ بڑھاپے میں آدمی صرف پیش گوئی ہی کر سکتا ہے اس عظیم انقلاب کو دیکھنے کے لیے زندہ رہنے کی تمنا نہیں کر سکتا۔"

مصیبت اور آزمائش کے اس زمانے میں جوانمرد انجلو نے کارل مارکس کی فراخدلی سے مالی امداد کر کے دوستی کا حق ادا کر دیا اور قدم قدم پر اسے سہارا دیا۔ اس کی وفا شعاری اور بے نفسی آڑے نہ آتی تو کارل مارکس پے درپے صدمات کی تاب نہ لا سکتا اور اپنے کام کو سرانجام دینے سے قاصر رہتا ان کی دوستی کو ذہنی و قلبی موافقت، مشترکہ نصب العین اور جہد و عمل نے مضبوط بنا دیا تھا۔ کارل مارکس کے فکری اور عملی کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے میکس ملین روبل اور مارگرٹ منالے نے لکھا ہے: [1]

"مارکس نے اپنی ساری زندگی ایک ہی مقصد کے لیے وقف کر دی تھی۔ پرولتاریہ کی جدوجہد کے حوالے سے بنی نوع انسان کی آزادی کا حصول اس کے خیال میں پرولتاریہ جسمانی اور ذہنی پہلوؤں سے معاشرے کے بہترین افراد ہیں۔ اس مقصد کے لیے مارکس نے اپنی صحت، کنبہ، دوست اور احباب سب کچھ ہی قربان کر دیا۔ اس نے پرولتاریہ کو ایک

1. Mark without Myth

انقلابی نظریہ فراہم کیا اور بذات خود ان کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔
اس نے سرمایہ داری نظام کی زوال پذیری اور محنت کش عوام کے روشن مستقبل کی جانب توجہ دلائی۔ اس نے اپنی زندگی کے بہترین سال جلاوطنی میں بسر کیے اور علالت' افلاس' احتیاج اور گھریلو مشکلات اس کی زندگی کی مسرتوں کو مسموم کرتی رہیں۔ اس کے باوجود اس نے مختلف ملکوں کی مالی پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور ان حکومتوں کے گماشتوں کی اس نوع کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اس نے شہرت اور دولت دونوں پر لات ماردی اور روح فرسا مصائب میں بھی اپنا کام جاری رکھا۔"

جینی کی موت کے وقت مارکس خود صاحب فراش تھا اور ڈاکٹر نے اسے نقل و حرکت کی سخت ممانعت کر رکھی تھی۔ مارکس کو اس بات کا سخت افسوس تھا کہ وہ آخری دنوں میں اپنی بیوی کی تیمارداری نہ کر سکا۔ کئی ہفتے دونوں میاں بیوی ملحقہ کمروں میں بیماری کی حالت میں بے بس پڑے رہے۔ مارکس جینی کی تدفین میں بھی شریک نہ ہو سکا۔

کارل مارکس کی عظمت پر اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ ان نامساعد حالات میں بھی اس نے اپنا فکری و عملی کام پورے عزم و حوصلے کے ساتھ جاری رکھا۔ اس نے آدم سمتھ' ریکارڈو اور مالتھس کی کتابوں کا خصوصی مطالعہ کیا اور برٹش میوزیم میں کئی برس کے مسلسل مطالعے اور انگلستان کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے احوال کے مشاہدے کے بعد اپنی عہد آفرین کتاب ''سرمایہ'' تصنیف کی' جو 1876ء میں شائع ہوئی' جسے بجا طور پر محنت کشوں کی انجیل کہا جاتا ہے اس میں مارکس نے قدر زائد کا انکشاف کر کے سرمایہ داروں کے بے رحمانہ جبر و استحصال کو بے نقاب کیا اور دنیا بھر کے محنت کشوں کی رہنمائی کے لیے انھیں نظریاتی بنیاد فراہم کی۔ مارکس سے پہلے ریکارڈو نے اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی تھی کہ سرمایہ کا وجود محنت کے استحصال پر قائم ہے لیکن اس کا ذہن معاشی استحصال کے اصل اسباب تک منتقل نہ ہو سکا۔ ان اسباب کا تجزیہ کارل مارکس نے یہ کہہ کر کیا کہ محنت ایک جنس ہے' جسے کارخانہ دار دوسری اجناس کی طرح ارزاں خریدتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع کما سکے' جو پیداوار محنت کش پیدا کرتا ہے اور جو اجرت اسے ملتی ہے اس کا فرق زائد قدر ہے جو سرمایہ دار کا منافع بن جاتی ہے۔

''سرمایہ'' کا پہلا ترجمہ روسی زبان میں شائع ہوا۔ روس میں احتساب کا محکمہ نہایت سختی سے ترقی پسندانہ خیالات کا انسداد کر رہا تھا لیکن جناب محتسب نے محض اس لیے ''سرمایہ'' کے ترجمے کی اجازت دے دی کیونکہ اسے پڑھ کر ان کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ سرمایہ کی اشاعت کے بعد بورژوا دانشوروں نے اسے ''خاموشی کی سازش'' سے فنا کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی' جس کا کارل مارکس کو بھی احساس تھا۔ اس نے کوگل مان کو ایک خط لکھا کہ ''صحافیوں کا غول'' یہ نہیں چاہتا کہ اس کتاب پر کوئی محققانہ یا ثمر آور مباحثہ ہو سکے۔ یہ قدرتی بات تھی۔ اہل علم معاصرانہ چشمک کے تحت کسی ایسے شخص کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتے جو تحقیق اور علیمت میں ان پر برتری رکھتا ہو اور چپ سادھ کر اسے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ خاموشی کی یہ سازش بالآخر ناکام ہو جاتی ہے اور وقت نئے منصف کو وہ مقام بخشتا ہے جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔ کارل مارکس کے علمی کارناموں میں زندگی کی حرارت تھی' شگفتگی تھی' انسان دوستی کی روشنی تھی' مستقبل کی نوید تھی۔ اس لیے بورژوا دانشور اسے دفنانے میں ناکام رہے اور خود تاریخ کے ملبے میں دفن ہو گئے۔ دوسری طرف کارل مارکس کے اٹھائے ہوئے نکات کا تحقیقی جواب دینے کی بجائے جو ان کے بس کی بات نہیں تھی' نہایت ڈھٹائی سے اس پر ذاتی حملے کیے گئے اور ہر طریقے سے اسے رسوا کرنے کے منصوبے باندھے گئے۔ ڈیورنگ اور باکونن نے ''سرمایہ'' کے مطالب پر کڑی نکتہ چینی کی جس کا انجلز نے مسکت جواب دیا' آخر اہلِ دانش و بینش نے مارکس کی عظمت کو تسلیم کر لیا۔ بلفورٹ باکس نے مارکس کو جدید دور کا عظیم اشتراکی مفکر [1] کہا۔ اپنے شوہر کی عظمت اور مقام کی اس پہچان سے جینی کو دلی خوشی ہوئی' جس سے اس کی زندگی کے آخری شب و روز خوشگوار ہو گئے۔

''سرمایہ'' کی اشاعت سے کارل مارکس کو کچھ بھی مالی فائدہ نہیں ہوا۔ اس نے مزاحاً کہا کہ اس کتاب سے اسے اتنی یافت بھی نہیں ہوئی' جتنی قیمت کے سگار اس نے اسے لکھتے وقت پھونک دیئے تھے۔

روس کی ایک انقلابی خاتون ویرازا سولچ نے جو رجعت پسندوں پر قاتلانہ حملے کرنے میں ہمیشہ مستعد رہتی تھی۔ کارل مارکس کو خط میں لکھا کہ غالباً آپ کو روس کے زرعی

---

1 Leaders of Modern Thought

مسائل اور کسانوں کی کیمون سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مارکس نے اس کی غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے لکھا کہ مجھے کسانوں کی تحریک سے پوری ہمدردی ہے اور مجھے امید ہے کہ انقلاب کی شروعات روس ہی سے ہوگی۔ فی الحقیقت یورپ میں 1848ء کے انقلاب کی ناکامی اور پیرس کیمون کی شکست کے بعد جب مزدوروں نے مہینوں تک رجعت پسندوں کے خلاف مردانہ وار جنگ لڑی تھی۔ مارکس نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ انقلاب کی کامیابی کے لیے مزدوروں کا کسانوں سے اتحاد ضروری ہوتا ہے۔ 1869ء میں مارکس نے روسی زبان سیکھ لی اور ہرزن' ڈوبرولیوبوف اور چرنی شیوفسکی جیسے روشن خیال ترقی پسندوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ موخر الذکر کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ چرنی شیوفسکی نے بورژوا نظام کو بڑی خوبی سے بے نقاب کیا ہے۔ اس نے روس کے کسانوں کی جدوجہد کو انقلاب کے لیے ایک نیک فال قرار دیا تھا۔ اس کی ہمدردیاں دنیا بھر کے کچلے ہوئے عوام کے ساتھ تھیں۔ اس نے 1857ء کی جنگِ آزادی اور انگریزوں کے خلاف چینیوں کی مسلح جدوجہد کی حمایت کی تھی۔

نظریاتی محاذ پر کارل مارکس نے پرودوں' لسال' باکونن اور فوئر باخ کے افکار کا عالمانہ تجزیہ کر کے ان کی کوتاہیوں کی نشان دہی کی۔ اسے باکونن کی نراجی فکر سے سخت اختلاف تھا اور باکونن کے برعکس اشتراکی معاشرے میں وہ ریاست کی بحالی کو ضروری سمجھتا تھا۔ باکونن ریاست کو یک قلم اور یکسر ختم کر دینے پر بضد تھا۔ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ مارکس ہی کا نظریہ قرین صحت تھا۔ مارکس نے لسال کے "شخصیت کے مسلک" پر بھی کڑی گرفت کی اور کہا کہ انقلابی کشمکش میں فیصلہ کن کردار عوام ہی ادا کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی شخصیت خواہ وہ کوئی بھی ہو' تن تنہا انقلاب برپا کرنے یا انقلابی تحریک کو کامیابی سے چلانے پر قادر نہیں ہو سکتی۔ لینن کی وفات کے بعد سٹالن نے اپنی شخصیت کا مسلک قائم کیا تھا' جس کے ضرر رساں اثرات تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ کارل مارکس' فوئر باخ کے مادی نظریے کا حامی تھا۔ وہ اس بات کا معترف تھا کہ فوئر باخ نے ہیگل کی مثالیت کا طلسم توڑ کر ایک قابلِ قدر فکری کارنامہ انجام دیا تھا۔ لیکن اس پر گرفت بھی کی اور کہا کہ فوئر باخ نے ہیگل کے الٰہیات کو منہدم کر کے اخلاقیات میں ازلی و ابدی قدروں کا ذکر کیا ہے۔ جو مثالیت ہی کی ایک صورت ہے۔ مارکس نے پرودوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ارتقائی عمل

سے انقلاب لانا ممکن نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے محنت کشوں کو مسلح جدوجہد کرنا پڑے گی۔ مارکس نے منطقی استدلال اور حقائق و شواہد سے موقع پرستوں مزاجیوں اور ترمیم پسندوں کی فکری خامیوں کی وضاحت کر کے پرولتاریہ کو راست نہج فکر عطا کی۔

مارکس نے 1864ء میں پہلی بین الاقوامی مجلس لندن میں بلائی۔ جس کے بعد دنیا بھر کے انقلابی ہدایات لینے اس کے گھر آنے لگے۔ مسلسل آلام و امراض کے باعث اس کی صحت مخدوش ہوگئی۔ وہ بیوی کی موت کے صدمے سے سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ اس کی بڑی بیٹی جینی بھی راہی ملک عدم ہوئی' جو اسے بہت پیاری تھی' اب وہ اکثر صاحب فراش رہنے لگا اس حالت میں اس کے حصول علم کی پیاس نہ بجھی۔ جب اس پر غم کا غلبہ ہوتا تو وہ ریاضیات اعلیٰ کے عقدے حل کر کے جی بہلایا کرتا تھا۔ اسے یونانی' لاطینی' فرانسیسی' ہسپانوی' انگریزی اور رومانوی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ اپنے محبوب مصنفین اسکیلس' سروانیٹز اور بالزک کی کتابیں اصل زبانوں میں پڑھتا تھا اور اپنے بچوں کو ان کے مطالب سمجھایا کرتا تھا۔ اسے الف لیلہ ولیلہ اور مقامات حریری بھی بہت پسند تھیں اواخر عمر میں اس نے عربی زبان سیکھنے کا بھی ارادہ کیا لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ وہ ایک جید مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ مزاح سے بھی بہرہ ور تھا۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھ بھیجا کہ آپ کی معاشیات پر کتاب کس مرحلے میں ہے؟ مارکس نے جواب دیا کہ کتاب تو مکمل ہوگئی ہے بس اس کی ضخامت بڑھا رہا ہوں کیونکہ کتاب جتنی ضخیم ہو جرمن اسے اتنا ہی پسند کرتے ہیں۔

کارل مارکس کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو وہ ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق روزانہ سنکھیا کی قلیل مقدار بطور دوا استعمال کرنے لگا۔ ایک دن انجلز اس کی مزاج پرسی کو آیا تو مارکس کی خادمہ ہیلن نے اسے بتایا کہ وہ مطالعے کی کرسی پر دراز آرام کر رہے ہیں۔ انجلز نے قریب جا کر دیکھا تو اس کا دوست ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا۔ انجلز نے مارکس کی قبر پر آخری خطبہ دیتے ہوئے کہا:

"اس کا نام اور کام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔"

اس کی موت کی خبر سن کر دنیا بھر کے محنت کشوں کی آنکھیں اپنے محسن اور رہنما کے غم میں اشکبار ہوگئیں۔ آج بھی جب اس کے بے پناہ مصائب و آلام کے ساتھ اس کے ایثار نفس' انسان دوستی اور عزیمت و استقامت کا ذکر آتا ہے تو بے اختیار سینوں میں

جذبات جہد و عمل جوش مارنے لگتے ہیں اور آنکھیں روشن مستقبل کے تصور سے دمک اٹھتی ہیں۔ کارل مارکس کی موت کے بعد انقلابی تحریکوں کی باگ ڈور انجلو کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے بڑی تندہی سے مارکس کا تحقیقی اور انقلابی کام جاری رکھا اور اس کے افکار کے ابلاغ کے لیے متعدد کتابیں لکھیں، وہ ایک امیر باپ کا بیٹا تھا لیکن انقلابی جذبے سے سرشار ہو کر اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ اس کا گھر سارے یورپ کے انقلابیوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اس نے مارکس کی کتاب "سرمایہ" کی باقی جلدیں نہایت عرق ریزی سے مرتب کر کے شائع کیں۔ آخر پچھتر برس کی عمر میں اپنے انقلابی فرائض انجام دے کر انجلو اس جہانِ فانی سے گذر گیا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش جلا دی گئی اور راکھ ایسٹ بورن کے مقام پر جہاں وہ سیر کے لیے جاتا تھا، سمندر میں بہا دی گئی۔

جدلیاتی مادیت

ہیگل کی فکر میں مثالیت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی تھی۔ یہ کہہ کر کہ مادی عالم ذہن کی تخلیق ہے اس نے مادے کے معروضی وجود سے انکار کیا۔ یہ نقطۂ نظر جدید سائنس کے منافی تھا' جس میں عالمِ مادی کو حقیقی سمجھ کر اس کے قوانین دریافت کیے جاتے ہیں۔ ہیگل کی مثالیت کے خلاف جو ہمہ گیر ردِّ عمل ہوا' کم و بیش تمام نئے مکاتب فلسفہ پر اس کا عکس پڑتا ہے۔ ہیگل کے ناقدین میں ہربارٹ اور فوئر باخ پیش پیش تھے۔ ان فلاسفہ نے مثالیت کو رد کر دیا اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ حیات ہی علم کے اصل ماخذ ہیں اور سچا اور قابلِ اعتماد علم حواس ہی کے وسیلے سے حاصل ہوتا ہے البتہ ذہن محسوسات کو منظم ضرور کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انہوں نے مثالیت پسندوں کا یہ دعویٰ رد کر دیا کہ مشاہدے اور تجربے کے بغیر بھی ذہن بذاتِ خود علمی صداقتوں تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہے۔

لڈوگ فوئر باخ (1804ء-1872ء) ارلانگن یونیورسٹی میں فلسفے کا استاد تھا۔ وہ مذہب اور مثالیت کا مخالف تھا اور انہیں بے مصرف تخیل آرائی کے کرشمے سمجھتا تھا۔ اس کی مادیت پسندی اور الحاد کے باعث اسے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا اور وہ دیہات میں گوشہ گیر ہونے پر مجبور ہو گیا۔ فوئر باخ نے ہیگل کی مثالیت کا ردّ مدلل انداز میں کیا۔ اس کی یہ فکری دین قابلِ قدر ہے۔ اس نے مذہب اور مثالیت کے مابین گہرے ربط و تعلق کا ذکر کیا اور کہا کہ اہل مذہب اپنے دینی عقائد کا اثبات مثالیت پسندی سے کرتے رہے ہیں کیونکہ مذہب اور مثالیت میں فکری و ذوقی رشتہ موجود ہے۔ کارل مارکس اور انجلز نے یہ کہہ کر بات کو آگے بڑھایا کہ مقتدر طبقہ مذہب کی طرح مثالیت سے بھی اپنے خصوصی مفادات کے

تحفظ کا کام لیتا رہا ہے۔

فوئر باخ' کارل مارکس اور ہیگل کے درمیان ایک ضروری واسطہ ہے' اس سے متاثر ہو کر کارل مارکس جو شروع شروع میں ہیگل کی مثالیت کا پر جوش مداح تھا' مادیت سے رجوع لایا لیکن فوئر باخ نے ہیگل کی مثالیت کے ساتھ اس کی جدلیات کو بھی رد کر دیا تھا۔ اس طرح بقول کارل مارکس پانی کے ساتھ بچے کو بھی ٹب سے باہر پھینک دیا۔ فوئر باخ کی مادیت اس پہلو سے ناقص ہے کہ اس نے مثالیت کی تردید کے باوجود اپنی اخلاقیات میں مثالیاتی رویے کو برقرار رکھا یعنی وہ بھی مثالیت پسندوں کی طرح کہتا ہے کہ اخلاقی قدریں ازلی و ابدی ہیں۔ مادی احوال سے بلند تر ہیں اور انسان کی سرشت میں موجود ہیں' وہ اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکا کہ مادی ماحول کے بدلنے کے ساتھ اخلاقی قدریں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔

مارکس اور انجلز نے ہیگل کے تصورات کی پیکار کو طبقات معاشرہ کی آویزش میں منتقل کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہیگل کا یہ خیال درست ہے کہ کائنات اور فکرِ انسانی بدلتی رہتی ہے لیکن اس کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذہن میں جو تغیرات ہوتے ہیں وہی عالم مادی میں بھی وارد ہوتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ عالم مادی اور معاشرے کے بدلنے کے ساتھ تصورات بھی بدل جاتے ہیں چنانچہ کارل مارکس کہتا ہے: [1]

> "جرمن فلسفہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے' ہمارا فلسفہ زمین سے آسمان کی طرف جاتا ہے۔"

قدیم یونانی فلاسفہ اور 18ویں صدی عیسوی کے فرانسیسی قاموسیوں کی مادیت مابعد الطبیعیاتی تھی یعنی وہ کائنات کو جامد' ساکت اشیاء کا ملغوبہ مانتے تھے اور اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ کائنات اشیاء کا نہیں اعمال کا مجموعہ ہے۔ انجلز لکھتا ہے:

> "دنیا بنی بنائی اشیاء کا ملغوبہ نہیں ہے بلکہ گوناگوں اعمال کا مجموعہ ہے جس میں اشیاء جو بظاہر ہمیں ساکن دکھائی دیتی ہیں اور ان کے عکس جو ہمارے ذہنوں پر پڑتے ہیں' بدلتے رہتے ہیں۔"

کارل مارکس روایتی مادیت کو میکانکی کہتا ہے اس کے خیال میں 19ویں صدی

---

1. The German Ideology

میں مادیت مابعد الطبیعیاتی گرفت سے آزاد ہو کر جدلیات کے قریب تر آ گئی ہے کیونکہ جدید سائنس کی روح جدلیاتی تھی۔ مارکس نے مادیت کو مابعد الطبیعیات سے علاحدہ کیا۔ اس میں ہیگل کے جدلیاتی اصول شامل کیے اور اپنے فلسفہ جدلیاتی مادیت کی تدوین کی۔ اس طرح کارل مارکس نے پرولتاریہ کو وہ نظریاتی بنیاد فراہم کی جس کے بغیر ان کی انقلابی جدوجہد کو بامقصد اور ثمر آور بنانا ممکن نہیں تھا۔ جدلیاتی مادیت کے اصول درج ذیل ہیں:

1- مادہ شعور پر مقدم ہے اور شعور مادے ہی کی ایک صفت ہے کیونکہ شعور مغز سر کا فعل ہے اور مغز سر مادی ہے۔ مادہ کائنات میں معروضی صورت میں موجود ہے۔ جس کا عکس ہمارے ذہن پر پڑتا ہے۔ عالم مادی میں جو قوانین کارفرما ہیں وہ انسانی ارادے سے بالاتر ہیں۔ انسان ان قوانین کو بدل دینے سے قاصر ہے البتہ ان کا انکشاف کر کے اور انہیں اچھی طرح ذہن نشین کر کے وہ ان سے حسب منشا کام لے سکتا ہے۔ مثالیت پسندوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ عالمِ مادی کو ذہن و شعور نے خلق کیا ہے کیونکہ کرۂ ارض کم و بیش پچاس ارب برس قبل سورج سے جدا ہوا تھا جب کہ انسان کے آباؤ اجداد کے ظہور پر بہ مشکل دو کروڑ برس گذرے ہیں۔ کائنات پر چند معروضی قوانین حاوی ہیں۔ کانٹ نے کہا تھا کہ نیچر میں کوئی قانون نہیں ہے۔ اس میں محض انتشار و فساد 1 ہے اور قوانین انسانی ذہن نے اس سے منسوب کر دیئے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر موضوعی 2 ہے۔ جدلیاتی مادیت کی رو سے یہ قوانین ذہن و شعور سے علاحدہ اپنی مستقل صورت میں موجود ہیں۔ سائنس کا کام انہیں دریافت کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ سائنس دان وہی قوانین دریافت کر سکتے ہیں جو پہلے سے موجود ہوں۔ عالم مادی کے قوانین کی یہی معروضیت 3 جدلیاتی مادیت کو مثالیت سے جدا کرتی ہے یہ خیال کہ مادہ ہمارے فکر و شعور سے آزاد اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ جدلیاتی مادیت کا بنیادی اصول ہے جس کی تائید ہمارے زمانے کے اکابر سائنسدانوں نے کی ہے۔ میکس پلانک لکھتا ہے:

"خارجی عالم کا انحصار ہم پر نہیں ہے بلکہ وہ مستقل بالذات حیثیت میں موجود ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ خارجی عالم پر حاوی

---

1 (Objectivity)   2 (Subjective)   3 Chaos

مطلق قوانین کا انکشاف ہی میرے خیال میں سائنسدانوں کی زندگی کا سب سے حیرت انگیز معمول رہا ہے۔"

اس نظریے پر صاد کرتے ہوئے آئن سٹائن کہتا ہے:

"تمام طبیعی علوم کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ خارجی عالم ادراک کرنے والے موضوع سے آزاد اور بے نیاز ہے۔"

منطق کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مادہ عالم خارجی کا وسیع ترین تصور[1] ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مثلاً جیسے شئے کا تصور قلم' میز اور کرسی وغیرہ کے تصورات سے وسیع تر ہے یا جیسے انسان کا تصور مردوں' عورتوں اور بچوں کے تصورات سے وسیع تر ہے۔ اسی طرح استدلال کرتے ہوئے ہم خارجی عالم کا وسیع ترین تصور معلوم کرنا چاہیں تو وہ مادے ہی کا تصور ہوگا لہٰذا مادہ ہی بنیادی حقیقت بھی ہے۔

2- عالم مادی میں کوئی بھی شئے مطلق' حتمی اور قطعی نہیں ہے۔ سب اشیاء مسلسل تغیر و حرکت کی حالت میں ہیں۔ انجلو نے کہا ہے:

"مادے کے بغیر حرکت کا تصور کرنا اتنا ہی محال ہے جتنا کہ حرکت کا تصور مادے کے بغیر کرنا۔"

3- تیسرا قانون اضداد وہی ہے جو ہیگل کی جدلیات کا بھی اہم اصول ہے یعنی ہر شئے میں اس کی ضد موجود ہے جو اس کی نفی کر دیتی ہے۔ اضداد کی جدل و پیکار ہر وقت جاری رہتی ہے اور حرکت و تغیر اسی کا نتیجہ ہے۔ اشیاء بدل جاتی ہیں کیونکہ ان کے بطون میں مثبت اور منفی کا تضاد موجود ہوتا ہے۔

4- چوتھا قانون یہ ہے کہ ہر اثبات میں اس کی نفی موجود ہوتی ہے اور ہر نفی کی نفی ہو جاتی ہے جس سے اثبات کا عمل دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ کارل مارکس نے ہیگل کی جدلیات کے اس اصول کی ترجمانی یوں کی کہ مثلاً جاگیرداروں کو اپنا کام چلانے کے لیے روپے کی ضرورت تھی جو انہیں ساہوکار اور تاجر فراہم کرتے تھے۔ محنت و مشقت غلاموں او کھیت مزدوروں سے لی جاتی تھی۔ یہ جاگیرداری معاشرے کا مثبت پہلو تھا لیکن اسی میں اس کی نفی بھی پوشیدہ تھی۔ زمانے کے

1. Concept

گذرنے کے ساتھ تجارت پیشہ طبقے نے جاگیرداروں کو کچل کر رکھ دیا۔ طاقت بورژوازی یا تاجروں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ صنعتی انقلاب کے بعد جابجا کارخانے کھل گئے جن میں ہزاروں مزدور کام کرنے لگے۔ جاگیرداروں کی نفی بورژوا ہی نے کی تھی۔ بورژوا کی نفی مزدور کر رہے ہیں جس سے نفی کی نفی ہو جاتی ہے اور معاشرہ انسانی ترقی کے راستے پر ایک قدم اور آگے بڑھ رہا ہے۔ البتہ نئے معاشرے میں سابق جاگیرداری دور کی بعض ترقی پرور روایات و اقدار باقی رہ جاتی ہیں۔ یہی قدروں کا تحفظ ہے۔

5- عالمِ مادی کی کوئی شئے ایک حالت پر برقرار نہیں رہ سکتی اور بالجبر اپنی ضد میں بدل جاتی ہے۔ اسی بنا پر ہرزن نے جدلیات کو "انقلاب کا الجبرا" کہا تھا۔

6- کائنات میں اشیاء ایک دوسرے سے الگ تھلگ موجود نہیں ہیں بلکہ ایک دوسری پر اثر انداز ہو کر ان میں تغیر و تبدل کرتی رہتی ہیں۔ اس قانون کا اطلاق انسانی علوم پر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ معاشیات' سیاسیات' اخلاقیات' عمرانیات اور ادبیات کا آپس میں گہرا ربط و تعلق ہے اور ان کے اصول و افکار ایک دوسرے میں نفوذ کرتے رہتے ہیں۔ علم کے مختلف شعبوں کا مطالعہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے کیا جائے تو آدمی فکری مغالطوں کا شکار ہو جائے گا۔

7- جدلیاتی مادیت کی رو سے عالم مادی دو قسم کی اشیاء پر مشتمل ہے (i) وجود: جو اصل ہے اور (ii) فکر و شعور جو اس کی فرع ہے۔ اس نظریے کا اطلاق معاشرہ انسانی پر کیا جائے تو معاشرے کے مادی احوال یا پیداواری قوتوں یا پیداواری وسائل کو وجود یا اصل سمجھا جائے گا اور سیاسیات' فلسفہ' مذہب' اخلاق' ادبیات وغیرہ اس اصل کی فروع ہوں گی جو قدرتاً اپنے اصل یا وجود سے وابستہ ہوں گی۔ جدید سرمایہ داری معاشرے کی مثال ہمارے سامنے ہے' اس معاشرے میں مسائل پیداوار نے مختلف طبقات کے مابین پیداواری علائق خلق کیے ہیں جو شخصی املاک اور استحصال پر مبنی ہیں۔ چنانچہ اس معاشرے کا سیاسی نظام بورژوائی اور پرولتاریہ کے علائق سے صورت پذیر ہوا ہے۔ بورژوائی وسائل پیداوار پر قابض ہیں اس لیے ریاست پر بھی انہی کا قبضہ ہے اور انہوں نے ریاست کو اپنے شخصی مفادات کے تحفظ کے لیے

آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ سیاسیات کی طرح اس معاشرے کے قانون' اخلاق' فلسفہ' آرٹ اور مذہب سے بھی بورژوائی کے مفادات اور شخصی املاک کے تحفظ کا کام لیا جارہا ہے۔

8- مارکس کی فکر میں جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت ایک ہی موضوع کے دو پہلو ہیں' جب معاشرہ انسانی کے ارتقاء پر جدلیاتی مادیت کے قوانین کا اطلاق کیا جائے تو اسے تاریخی مادیت کہا جاتا ہے۔ کارل مارکس کہتا ہے کہ جس طرح انسانی ذہن پر مادے کا عکس پڑتا ہے اسی طرح سماج کے معاشی نظام کا عکس اس کے مذہب' سیاسیات' آرٹ اور اخلاق پر پڑتا ہے۔ معاشی احوال اصل یا وجود ہیں اور جملہ علوم وفنون اس کے شعوری پہلو ہیں۔ جدلیاتی مادیت کی طرح تاریخی مادیت بھی حقیقت کی مادی ترجمانی اور تعبیر پیش کرتی ہے۔ جس کے باعث سماج کا سائنٹفک مطالعہ ممکن ہوگیا ہے۔ جدلیاتی مادیت کی رو سے وجود شعور پر مقدم ہے۔ تاریخی مادیت میں بھی کسی سماج کے معاشی احوال اس کے شعوری احوال' سیاسیات' اخلاق' آرٹ وغیرہ پر مقدم ہیں۔ جدلیاتی مادیت کی رو سے مادی دنیا بدلتے ہوئے اعمال پر مشتمل ہے اور یہ تبدیلیاں اشیاء کے داخلی تضادات کے تحت ہوتی ہیں۔ اس طرح تاریخی مادیت میں پیداواری قوتوں اور پیداواری علائق کا تضاد سماج میں تبدیلیوں کے باعث ہوتا ہے اور سماج ایک صورت سے دوسری صورت میں بدل جاتا ہے لہٰذا تاریخ محض چند پریشان اور منتشر واقعات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس کے عمل کا ارتقاء چند واضح اور محکم قوانین کے تحت ہوتا ہے۔ تاریخی مادیت کی وضاحت کرتے ہوئے مارکس اور انجلز نے کہا ہے کہ صبح تاریخ کا انسان قبائل کی صورت میں مل جل کر رہنے لگا تو سماج کی بنیاد پڑ گئی۔ لیوس مارگن نے اس دور کو قدیم اشتمالیت کا نام دیا ہے کیونکہ اس سماج میں شکار محنت کے اوزاروں اور خوراک کا اشتراک تھا۔ ہر شخص اپنی قوت کے مطابق محنت کر کے خوراک کا حق دار بنتا تھا۔ پیداواری قوتوں...... ان میں نیچر کا خام مواد محنت سے حاصل کیا ہوا تجربہ محنت کے اوزار اور خود محنت کش شامل ہیں...... میں اضافے کے ساتھ زرعی انقلاب برپا ہوا اور اس کے ساتھ شخصی املاک اور ریاست کے اداروں نے جنم لیا۔ زرعی معاشرے میں

طاقت ور سرداروں نے دریاؤں کے کنارے کی زرخیز اراضی پر قبضہ کر لیا اور کمزوروں اور جنگی قیدیوں کو غلام بنا کر ان سے کھیتی باڑی کا کام لینے لگے۔ پیداوار کے نئے وسائل نے پیداوار کے نئے علائق پیدا کیے اور معاشرہ آقا اور غلام کے طبقات میں بٹ گیا۔ غلاموں کو ان کی محنت کے ثمر سے اتنا ہی حصہ دیا جاتا تھا۔ جس سے وہ اپنا پیٹ پال سکیں۔ باقی حصہ آقاؤں کی جیب میں جاتا تھا۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ جب غلاموں نے بغاوتیں کرنا شروع کیں اور محنت سے جی چرانے لگے تو جاگیرداری سماج کی ابتداء ہوئی اور جاگیردار اور مزارع کے طبقات پیدا ہوئے۔ 18ویں اور 19ویں صدی میں سائنس کی ایجادات کے ساتھ پیداواری قوتوں میں اضافہ ہوا۔ وسائل پیداوار بدل گئے جس سے سرمایہ دار اور مزدور کے طبقات صورت پذیر ہوئے۔ جن ممالک میں اشتراکیت کے نفاذ کے ساتھ شخصی املاک اور اجتماعی طریق پیداوار کا تضاد رفع ہو گیا ہے وہاں پیداواری علائق امداد باہمی پر مبنی ہیں اور طبقاتی آویزش اور استحصال کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

تاریخی مادیت کا ایک اہم تصور یہ ہے کہ جب پیداواری قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے تو برسرِ اقتدار طبقہ جو پیداواری وسائل کا مالک ہوتا ہے محنت کشوں کو اس اضافے سے فیض یاب ہونے سے روکتا ہے۔ جس سے پیداواری علائق مخالفانہ روش اختیار کر جاتے ہیں اور طبقاتی کشمکش تیز تر ہو جاتی ہے۔ پیداواری قوتوں کو پوری طرح پنپنے کا موقع نہیں ملتا اور سماج مالی بحران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آج کل مغربی ممالک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ مغرب کے چند کھرب پتی اجارہ دار زر و مال سمیٹنے کے جنون میں مبتلا ہیں جبکہ پسماندہ اقوام کے کروڑوں افراد جن سے صنعت کاری کے لیے کچا مال لیا جاتا ہے، فاقے کاٹنے پر مجبور ہیں۔

تاریخی مادیت کا حاصل یہ ہے کہ معاشی احوال ہی عملِ تاریخ کے اصل محرک ہیں اور معاشی احوال ہی سیاسی، سماجی، اخلاقی، ادبی اور مذہبی قدروں کا تعین کرتے ہیں۔ کارل مارکس کے اس اجتہادِ فکر کا اس کے معترضین نے بھی اعتراف کیا ہے۔

برٹرنڈ رسل لکھتا ہے: [1]

"بحیثیت ایک مفکر کے مارکس راستی پر ہے۔ اس نے یہ اصول محکم

[1] Proposed Roads to Freedom

کیا کہ تاریخ میں سیاسی' مذہبی اور تاریخی ارتقاء معاشی ارتقاء کا سبب نہیں ہے بلکہ اس کا نتیجہ ہے یہ ایک عظیم ثمر آور خیال ہے جو کلی طور پر مارکس کی ایجاد بھی نہیں ہے کہ اس کا اظہار جزوی طور پر دوسروں نے بھی کیا ہے بہرصورت یہ اعزاز مارکس ہی کا ہے کہ اس نے اس اصول کو مضبوط استدلال سے ثابت کیا اور اسے اپنے معاشی نظام کا سنگِ بنیاد قرار دیا۔"

ول ڈیوران تاریخی مادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:[1]

"تاریخ کا بنیادی عامل شروع ہی سے معاشی رہا ہے۔ پیداوار' تقسیم اور صرف۔ مالک او رمزدور کا تعلق' امراء اور غربا کے مابین طبقاتی کشمکش یہی چیزیں بالآخر زندگی کے دوسرے شعبوں کو خواہ وہ مذہبی ہوں یا اخلاق فلسفیانہ ہوں یا سائنسی' ادبی ہوں یا فنی متاثر کرتی ہیں۔ پیداوار اور اس کے علائق معاشرے کی اقتصادی بنیادیں استوار کرتے ہیں جن پر قانون اور سیاسیات کی عمارت اٹھائی جاتی ہے اور جو سماجی شعور کو صورت شکل عطا کرتے ہیں۔ مادی اشیاء کی پیداوار کا طریقہ سماجی' سیاسی اور روحانی اعمال کی تشکیل کرتا ہے انسان کے وجود کا تعین اس کے شعور سے نہیں ہوتا بلکہ سماجی احوال اس کے شعور کا تعین کرتے ہیں۔ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے خیالات فلسفہ کے مکاتب فکر' اخلاقی اصول' مذہبی عقائد' جمالیاتی تعصبات اور فنی ذوق کو منطق اور غیر جانب دارانہ استدلال سے یہ ارتقاء بخشا ہے یہ اس کی بھول ہے وہ نہیں جانتا کہ بنیادی معاشی عوامل ہی اس کے خیالات کے رخ و رجحان کا تعین کرتے ہیں۔"

کارل مارکس کے معترضین نے کہا کہ اس نے تاریخی عمل میں صرف معاشی احوال ہی کو مؤثر قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مارکس کے خیال میں تاریخی عمل میں معاشی عنصر بنیادی عامل ضرور ہے لیکن واحد عامل نہیں ہے۔ انجلز نے ایک خط میں اس اعتراض کا جواب جے بلاک کو ان الفاظ میں دیا تھا:

"تاریخ کے مادی نظریئے کی رو سے پایانِ کار جو عنصر تاریخ پر اثر

---

1. Mansions of Philosophy

انداز ہوتا ہے وہ حقیقی زندگی کی پیداوار ہے۔ اس سے زیادہ نہ کسی مارکسی نے دعویٰ کیا ہے نہ میں نے ایسا کہا ہے اس لیے اگر کوئی شخص بات کو توڑ مروڑ کر یہ کہے کہ معاشی عنصر واحد عنصر فعال ہے تو وہ مسئلے کو بے معنی لفاظی میں محصور کر دے گا۔ معاشی احوال اساسی درجہ رکھتے ہیں لیکن ان پر جو نظام تعمیر کیا جاتا ہے' اس کے "متعدد عناصر" تاریخی کشمکش پر اثر انداز ہوتے ہیں اور بعض حالات میں اس کی ہیئت متعین کرنے میں کافی زیادہ اثر ڈالتے ہیں۔ ان تمام عناصر کے درمیان باہمی تاثیر و تاثر کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بہرحال جو نتائج بھی مرتب ہوتے ہیں ان میں انجام کار معاشی محرک ہی کو لازمی سمجھا جاتا ہے۔"

ایک دوسرے خط سے جو سٹارکن برگ کو لکھا گیا تھا' معلوم ہوتا ہے کہ انجلو متعدد عناصر سے سیاسی' قانونی' فلسفیانہ' مذہبی اور ادبی و فنی عناصر مراد لیتا ہے۔ انجلو کے الفاظ میں تاریخی مادیت کا حاصل یہ ہے کہ انسان پہلے کھاتا پیتا ہے' ستر پوشی کرتا ہے' ٹھکانہ تلاش کرتا ہے اور بعد میں فکر کرتا ہے۔ فن و ادب تخلیق کرتا ہے یا مذہبی عقائد رکھتا ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف بلاشبہ کارل مارکس کی دانش و بصیرت کا ایک روشن ثبوت ہے۔

کارل مارکس کی فکر کے چند اہم متعلقہ مسائل کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

نظریہ علم:

جدلیاتی مادیت کی رو سے ذہن و شعور مغز سر ہی کی صفت ہے اور مغز سر سے علاحدہ اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔ انسان کا ذہن حیوانات کے ذہن سے زیادہ ترقی یافتہ ہے کیونکہ یہ تجریدی فکر پر قدرت رکھتا ہے۔ مثلاً حیوان یہ تو جان لیتا ہے کہ یہ کوئی درخت ہے لیکن وہ درخت کے تصور کا شعور نہیں رکھتا۔ انسان بول چال کے طفیل تجریدی فکر کرنے کے قابل ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ الفاظ کے استعمال کے بعد تجریدی فکر کا اظہار ممکن نہیں ہے۔ نہ انسانی شعور کو الفاظ و تراکیب سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ انسان کے ذہن میں کوئی بھی خیال الفاظ کا جامہ اوڑھے بغیر نہیں آ سکتا۔ انسان کی بول چال کی صلاحیت گروہ میں رہ کر ابھری تھی۔ اس لیے انسانی شعور کو سماج ہی کی پیداوار کہا جائے گا۔ مارکس کہتا ہے کہ خارجی

عالم معروضی ہے یعنی وہ اپنے وجود کے لیے کسی ذہن کا محتاج نہیں ہے اس خارجی عالم کا عکس انسان کے ذہن پر پڑتا ہے۔ ذہن کی عکس پذیری جدلیاتی ہے یعنی موضوع اور معروض ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں ہیں بلکہ باہم مربوط ہیں اور ایک دوسرے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ 18ویں صدی عیسوی کے فرانسیسی مادیت پسند کہتے تھے کہ فکر کا صدور مغز سر سے ایسے ہوتا ہے جیسے کہ مثلاً جگر صفرا پیدا کرتا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ ذہن مادی نہیں ہے جیسا کہ ان کا دعویٰ تھا بلکہ حقیقی اشیاء کا عکس ہے۔ یہ عکس فوٹو کی طرح کا نہیں ہوتا کیونکہ حقیقی اشیاء انسان کے ذہن میں منعکس ہو کر بدل جاتی ہیں۔ ذہن میں اشیاء نہیں ہوتیں بلکہ ان کے عکس یا تمثالی پیکر [1] ہوتے ہیں مثلاً جب میں کسی کتاب کو دیکھتا ہوں تو ظاہراً میرے ذہن میں وہ کتاب نہیں ہوتی بلکہ اس کا عکس یا خیال ہوتا ہے۔ پہلے کتاب ہے جو حقیقت ہے پھر اس کا عکس ہے جو ذہن پر پڑتا ہے لہٰذا فکر [2] حقیقت کا عکس ہے۔ جدلیاتی مادیت میں فکری نتائج کو حتمی نہیں سمجھا جاتا کیونکہ خارجی عالم ذہن میں منعکس ہو کر بدل جاتا ہے اور ذہن بذات خود خارجی حقائق پر اثر انداز ہو کر انہیں تبدیل کر دیتا ہے۔ جدلیاتی مادیت کی رو سے علم اس وقت صداقت بنتا ہے جب وہ حقائق سے مطابقت رکھتا ہو اور اس کی تصدیق عمل سے کی جا سکے لہٰذا عمل ہی صداقت کا معیار بھی ہے اور علم کا مصدر بھی یعنی پہلے حسیات معلومات کی صورت اختیار کرتی ہیں پھر ان معلومات سے نتائج فکر اخذ کیے جاتے ہیں پھر عمل سے ان نتائج فکر کی تصدیق کر کے انہیں صداقت کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم کسی صورت میں علم یا نظریئے کو عمل سے جدا نہیں کر سکتے جو نظریہ عمل میں نہ ڈھل سکے وہ بانجھ ہوتا ہے اور جس عمل کے پیچھے کوئی نظریہ نہ ہو وہ بے ثمر اور بے مصرف ہوتا ہے۔ اسی بنا پر لینن نے کہا ہے کہ جدلیاتی مادیت کے نظریئے اور انقلابی عمل میں کامل اتحاد کا ہونا ضروری ہے۔

کارل مارکس کے خیال میں فلسفی یا دانش ور وہ نہیں جو گوشہ عافیت میں بیٹھ کر مکڑی کی طرح اپنے اندرون سے افکار و انظار کے جالے پورتا رہتا ہے بلکہ حقیقی فلسفی وہ ہے جو صاحب فکر ہونے کے ساتھ ساتھ محنت کشوں کی عملی جدوجہد میں مردانہ وار حصہ بھی لیتا ہے۔ کارل مارکس کہتا ہے کہ عملی اقدام کرنے سے پہلے کسی سیاسی و معاشی صورت

---

1. Image
2. Thought

احوال کا تجزیہ حقیقت پسندانہ انداز میں کرنا ضروری ہے اور یہ کام ترقی پسند دانشور ہی انجام دے سکتے ہیں چنانچہ ایک سچا دانش ور کسانوں' مزدوروں اور اپنے ہم خیال دانشوروں سے ذہنی و عملی رابطہ قائم رکھتا ہے کیونکہ طبقاتی کش مکش میں دانشوروں کی نظریاتی جدوجہد کو پرولتاریہ کی سیاسی جدوجہد سے مربوط کر کے ہی انقلاب کے لیے راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔

جبر و قدر:

انسان اپنے افعال میں مجبور ہے کہ مختار ہے یہ سوال صدیوں سے فلاسفہ کو پریشان کرتا رہا ہے۔ جبری [1] انسان کو مجبور محض مانتے ہیں ان میں تقدیر پرست بھی شامل ہیں' جن کے عقیدے کے مطابق انسان اپنے نوشتۂ تقدیر کو بدل دینے سے قاصر ہے۔ گوتم بدھ' شنکر اچاریہ' ابن العربی' عمر خیال اور شوپنہار' مشہور جبری ہو گذرے ہیں۔ اس کے برعکس بعض اہلِ فکر انسان کو مختار مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان اپنے افعال میں آزاد ہے۔ ان میں ارسطا طالیس' لائب نِز' بشپ بارکلے اور برگساں قابلِ ذکر ہیں۔ یاد رہے کہ شروع سے قدر و اختیار کا تعلق مذہب اور مثالیت سے اور جبر کا ناطہ سائنس سے استوار رہا ہے۔ اہلِ مذہب اور مثالیت پسند کہتے ہیں کہ انسان کی روح اور اس کا ذہن مادی نہیں ہیں اور ازل سے موجود ہیں۔ اس لیے ان پر فطرت کے قوانین یا جبر کا اطلاق نہیں ہو سکتا لہٰذا انسان اپنی روح اور ذہن کے حوالے سے فاعلِ مختار ہے۔ ان کے خیال میں تاریخی ارتقاء کے عمل میں معروضی قوانین کی تلاش بے سود ہے کیونکہ تاریخی واقعات کا صدور انسان کے آزاد ارادے اور ذہن سے ہوتا ہے۔ اہلِ مذہب قدر و اختیار کے قائل اس لیے ہیں کہ قانونِ سبب و مسبب کی جبریت کو تسلیم کرنے سے ان پر معجزات کا انکار لازم آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا اس قانون کا پابند نہیں ہے اور کائنات میں جب چاہے اور جیسی بھی چاہے تبدیلی کر سکتا ہے اہلِ مذہب جزا و سزا پر عقیدہ رکھتے ہیں جس کے لیے انسان کا فاعل مختار ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ بندہ مجبور ہو گا تو وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہیں ٹھہرے گا لہٰذا اسے نیک اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا دینا قرینِ انصاف نہیں ہو گا۔ اہلِ مذہب اور مثالیت پسندوں کے خلاف مادیت پسند شروع سے جبرِ مطلق کو مانتے رہے ہیں۔ وہ خدا اور

---

1. Determinist

روح کے وجود سے منکر ہیں اور ذہن کو مادے ہی کی صفت مانتے ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں قدر و اختیار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ کہتے ہیں کہ کائنات کی ہر شئے اور ہر عمل سبب و مسبب[1] کے قانون کا پابند ہے۔ یعنی ہر مسبب کا لازمی ایک سبب ہوتا ہے۔ دوسری اشیء اور فطری مظاہر کی طرح انسان بھی سبب و مسبب کے قانون کا پابند ہے لہٰذا مجبور محض ہے۔ کارل مارکس کلاسیکی مادیت پسندوں کے اس جبر مطلق کا قائل نہیں ہے۔ اس کے خیال میں ان مادیت پسندوں کا یہ خیال تو درست ہے کہ انسان کا ذہن مادے کی صفت ہے لیکن انہوں نے انسانی ذہن و شعور کی فعالیت[2] سے انکار کر کے تقدیر پرستوں[3] کے جبر مطلق پر صاد کر دیا ہے۔ مثالیت پسندوں کے قدر و اختیار اور کلاسیکی مادیت پسندوں کے جبر مطلق کے برعکس کارل مارکس جبر و اختیار کے اتحاد کا قائل ہے۔ اس کا استدلال درج ذیل ہے:

1- نیچر اور اس کے قوانین معروضی ہیں۔ نیچر انسان کے ظہور سے پہلے موجود تھی لہٰذا وہ انسان کے ذہن و شعور پر مقدم ہے۔ نیچر کے قوانین سے مطابقت پیدا کر کے ہی بن مانس صحیح معنوں میں انسان بنا تھا۔

2- جب تک نیچر کا کوئی قانون انسان کے علم میں نہ ہو وہ اس کے سامنے مجبور ہوتا ہے لیکن اس قانون کا شعور ہوتے ہی قانون انسان کی گرفت میں آ جاتا ہے اور وہ اس سے حسب منشا کام لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ قدیم پتھر کے زمانے میں کوندے کی لپک اور رعد کی کڑک سے انسان دہشت زدہ ہو کر رہ جاتا تھا لیکن جب انسان نے اس کا راز پا لیا تو وہ برقی توانائی پر قابو پا کر اس سے اپنی ضروریات پوری کرنے لگا گویا انسان نیچر کی تسخیر پر قادر اس لیے ہوا ہے کہ اس نے نیچر کے قوانین کو سمجھ لیا ہے۔

3- انسان کے قدر و اختیار کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ معروضی قوانین کی گرفت سے آزاد ہو گیا ہے یہ صریحاً ناممکن ہے لیکن انسان نے اس جبریت کے باوجود فطرت کے اعمال اور اس کے قوانین کا شعور پیدا کر کے ان پر قابو پا لیا ہے گویا اس کا قدر و اختیار جبر ہی کے شعور کا دوسرا نام ہے جیسا کہ لینن نے کہا تھا:

"قدر و اختیار وہ جبر ہے جس کا علم ہو جائے۔"

---

1. Cause and Effect 2. Activity 3. Fatalists

ہیگل نے بھی جبر و اختیار کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے کہا تھا کہ انسان جبر کے وقوف سے قدر و اختیار کو پالیتا ہے کیونکہ اس کے الفاظ میں:

"جبر اس وقت تک اندھا ہوتا ہے' جب تک اسے سمجھا نہ جاسکے۔"

کارل مارکس کے یہاں قدر و اختیار کا مطلب نیچر کے قوانین سے آزاد ہونے کا نہیں ہے بلکہ اس کے قوانین کا علم ہے۔ قدیم پتھر کے زمانے کا انسان نیچر کے سامنے مجبور محض تھا لیکن جوں جوں وہ اس کے قوانین کو سمجھتا گیا وہ قدر و اختیار کی جانب قدم بڑھاتا گیا۔ قدری[1] کہتے ہیں کہ انسان اپنے ارادے سے تاریخ کا رُخ موڑ سکتا ہے کیونکہ وہ تاریخی ارتقاء کے عمل میں معروضی قوانین کے قائل نہیں ہیں' نہ سبب و مسبب کے قانون کو مانتے ہیں۔ وہ سبب اور مسبب کو ایک دوسرے سے علاحدہ سمجھتے ہیں جب کہ حقیقتاً ان دونوں میں عمل و ردِّ عمل کا رشتہ موجود ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ قدر و اختیار[2] کے ثبوت میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حادثہ سبب و مسبب کے قانون سے آزاد ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جبر کے دو پہلو ہیں داخلی اور خارجی۔ حادثہ سبب سے آزاد نہیں ہوتا بلکہ اس کا سبب خارج میں ہوتا ہے۔ پھول پھل میں بدل جاتا ہے تو یہ جبر ہے جس کے اسباب داخلی ہیں لیکن اگر طوفان پھولوں کو تباہ کردے تو یہ حادثہ ہوگا۔ جس کا سبب خارج میں ہوگا۔ فطرتی مظاہر کے ساتھ انسان بھی سبب و مسبب کے رشتے کا پابند ہے اور یہی قانون سائنس کی تحقیق کا سنگِ بنیاد بھی ہے۔ ہم نیچر کے قوانین سے آزاد نہیں ہوسکتے البتہ ان کے وقوف سے انہیں کام میں لاسکتے ہیں۔ یہ بات نیچر اور سماج دونوں کے حوالے سے درست ہے۔ کارل مارکس سے پہلے سماج کے معروضی قوانین سے کسی نے اعتناء نہیں کیا تھا۔ کارل مارکس نے تاریخ کے عملِ ارتقاء کے معروضی قوانین کی نشان دہی کی جن کے وقوف و شعور سے محنت کش اس قابل ہوگئے کہ وہ تاریخ کے جبر کو توڑ دیں اور اشتراکی انقلاب برپا کر کے استحصال سے نجات پالیں۔ کارل مارکس کے نظریے کا حاصل یہ ہے کہ انسانی آزادی جبر کی حدود سے تجاوز نہیں کرسکتی۔ اختیارِ مطلق کا کوئی وجود نہیں ہے جیسا کہ سرمایہ دار ممالک میں "فرد کی آزادی" کے نام پر دعویٰ کیا جارہا ہے۔ مغرب کے یہ "آزاد افراد" بہر صورت اپنے معاشی نظام کے غلام ہیں۔

1. Free
2. Willists

کارل مارکس کے جبر و قدر کے نظریے پر تنقید کرتے ہوئے ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ مارکس خود تقدیر پرست ہے کیونکہ وہ تاریخی قوانین کی معروضیت کو تسلیم بھی کرتا ہے اور سماج کو بدلنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ یہ فکری تضاد نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر اشتراکیت کا عمل میں آنا ناگزیر ہے جیسے کہ مارکس کا دعویٰ ہے تو پھر اس کے لیے جدوجہد کرنا یعنی چہ؟ ایک جرمن فلسفی روڈلف سٹاطر نے کہا تھا کہ جب چاند گرہن لگنا ہی ہے تو آدمی یہ کوشش کیوں کرے کہ چاند گرہن لگ جائے اور پھر اس مقصد کے لیے تنظیم بھی کرنے لگے۔ آج کل مغرب کے بورژوا دانشور چیسٹر باؤلز' آر وی ڈینلو وغیرہ روڈلف سٹاطر کی یہی دلیل اکتا دینے والی یکسانیت کے ساتھ دہرا رہے ہیں۔ ان کا کہنا بھی یہی ہے کہ جب بقول کارل مارکس تاریخی عمل جبر کے تحت آگے بڑھ رہا ہے تو کیوں نہ اس کے لابدی نتیجے کا انتظار کیا جائے۔ مارکسیوں کا انقلاب لانے کے لیے طبقاتی جدوجہد کرنا بذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ عملاً تاریخی عمل کے جبر کے منکر ہیں۔ بات یہ ہے کہ چاند گرہن میں انسانی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا کیونکہ فطرتی مظاہر انسانی جدوجہد سے بالاتر ہیں جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں انسان جن فطرتی مظاہر کے سامنے بے بس اور مجبور ہے' وہ ان کے اسباب و اثرات کو سمجھ کر ان کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکتا ہے مثلاً طوفانِ برق و رعد کو روکا نہیں جا سکتا لیکن اس کی آمد کی پیش بینی سے ہم اس کی ہلاکت آفرینی سے بچنے کا سامان کر سکتے ہیں۔ اسی طرح تاریخی ارتقاء کے قوانین کو سمجھ کر اور ان کے اسباب کا تجزیہ کر کے ہم انہیں اپنے مفادات کے مطابق ڈھال سکتے ہیں جیسے ہم نے برقی اور جواہری توانائی کے اسباب و عوامل سمجھ کر اس پر قابو پا لیا ہے۔ سائنسدان نیچر کا کوئی قانون دریافت کر کے اور مناسب آلات بنا کر اس سے انسان کی بہبود کا کام لیتے ہیں' اسی طرح بعض قابل افراد تاریخی ارتقاء کے قوانین دریافت کر کے ان کی روشنی میں مناسب انقلابی اقدام کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں جیسا کہ کارل مارکس' اینجلو' لینن اور ماؤزے تنگ کے کارناموں سے ظاہر ہے۔ چیسٹر باؤلز اور اس کے ہم خیال کلاسیکی مادیت پسندوں اور مثالیت پسندوں کی طرح جبر و اختیار کو ایک دوسرے سے جدا سمجھتے ہیں۔ انہوں نے جبر اور اختیار کی یہی دوئی [1] مارکس سے منسوب کر دی ہے حالانکہ مارکس نے صاف الفاظ میں اس بات کی وضاحت کی

1۔ Duality

ہے کہ جبر و اختیار میں اتحاد پایا جاتا ہے۔ اختیار جبر ہی کے شعور کا دوسرا نام ہے اور انسان جبر کی حدود میں رہ کر ہی اختیار سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ جبر و اختیار کے اس جدلیاتی ربط و تعلق کی وضاحت کر کے کارل مارکس نے ایک ایسے عقدہ کو سلجھا دیا جو قدیم زمانے سے اہلِ فکر کے لیے چیستاں بنا ہوا تھا۔

قدرِ زائد:

کارل مارکس سے پہلے آدم سمتھ اور ڈیوڈ ریکارڈر نے بجا طور پر محنت کو دولت کا ماخذ قرار دیا تھا۔ آدم سمتھ نے کہا کہ محنت ہی اکٹھی ہو کر سرمایہ بن جاتی ہے۔ ڈیوڈ ریکارڈو کے خیال میں کسی جنس [1] کی قدر و قیمت اس محنت سے معین ہوتی ہے جو اس پر صرف کی جاتی ہے۔ کارل مارکس نے ان کی کتابوں کا بنظرِ غور سے مطالعہ کیا اور یہ کہہ کر بات کو آگے بڑھایا کہ قوتِ محنت ایک جنس ہے جسے دوسری اجناس کی طرح بیچا جاتا ہے۔ اس نے سرمائے کے اکٹھا ہونے کے عمل کا تجزیہ کرتے ہوئے قدرِ زائد کا انکشاف کیا اور بتایا کہ یہی قدرِ زائد منافع بن جاتی ہے اور اس کے جمع ہونے سے سرمائے کے انبار لگ جاتے ہیں۔

کارل مارکس اپنی کتاب ''سرمایہ'' میں جنس کی تعریف سے اپنی بحث کا آغاز کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ جنس وہ شئے ہے جو کسی انسانی ضرورت کو پورا کرتی ہے نیز اس کا تبادلہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے جنس کی ایک خاص قدر [2] ہوتی ہے۔ اجناس میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ وہ انسانی محنت کی پیداوار ہوتی ہیں' یہ محنت انفرادی نہیں ہے بلکہ اجتماعی حیثیت رکھتی ہے۔ اجناس کی قیمت کو اس محنت سے معین کیا جائے گا جو بحیثیت مجموعی اس پر صرف کی جاتی ہے گویا قدروں کی حیثیت میں اجناس منجمد اوقاتِ محنت ہیں جو اس پر صرف کیے گئے ہیں۔ گذشتہ زمانے میں مال برائے مال کے تبادلے میں قاعدہ یہ تھا کہ پہلے جنس ہوتی' پھر اس کی قیمت لگائی جاتی جس کے بدلے میں دوسری جنس لی جاتی تھی۔ سرمایہ داروں کا معاشی قانون یہ ہے کہ پہلے روپیہ ہوتا ہے۔ پھر وہ جنس کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اس جنس کو بیچ کر روپے میں تبدیل کر لیا جاتا ہے جو پہلی رقم سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ روپے کی اصل قیمت میں جو اضافہ ہوتا ہے اسے مارکس نے زائد قدر کا نام دیا ہے۔ یہی اضافہ روپے کو سرمائے میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ زائد قدر اس وقت بنتی ہے جب محنت

---

[1] Commodity [2] Value

جنس میں بدل جاتی ہے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی۔ فرض کیجئے ایک مزدور روزانہ آٹھ گھنٹے کام کرتا ہے جتنی اجرت اسے ملتی ہے اس کی قیمت کا مال وہ دو گھنٹوں میں تیار کر لیتا ہے۔ باقی کے چھ گھنٹوں میں اس کی محنت سے جو مال تیار ہوگا اس کی قیمت کارخانہ دار کو ملے گی۔ جو کچھ بھی مزدور تیار کرتا ہے اگر اس کی اصل قیمت اسے مل جائے تو ظاہر ہے کہ کارخانہ دار کچھ بھی نفع نہیں کما سکے گا۔ چھ گھنٹے کی محنت کا مزدور کو کوئی معاوضہ نہیں ملے گا۔ اس طرح مزدور نہ صرف اپنی اجرت کے برابر مال تیار کرتا ہے بلکہ زائد قدر بھی پیدا کرتا ہے جو جنس کی صورت میں تبدیل ہو کر بیٹھے بٹھائے کارخانہ دار کے قبضے میں چلی جاتی ہے گویا اس دور کا کارخانہ دار اپنے مزدوروں سے اسی طرح استفادہ کرتا ہے جس طرح غلامی معاشرے میں آقا اپنے غلاموں سے کرتا تھا کئی پہلوؤں سے آج کے مزدور کی حالت غلام سے بھی بدتر ہے اکثر مزدور یک فنی مہارت رکھتے ہیں مثلاً بلب بنانا ہو تو سالم بلب ایک ہی مزدور نہیں بنائے گا۔ شیشہ ایک مزدور تیار کرے گا۔ تاریں دوسرا جوڑے گا چنانچہ ان مزدوروں کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ وہ اپنا مخصوص کام کریں یا بھوکوں مر جائیں۔

کارل مارکس کہتا ہے کہ زائد قدر سرمائے میں بدل جاتی ہے جس سے کارخانہ دار نئے نئے کارخانے نصب کر کے صنعت و حرفت کو مزید وسعت دیتا ہے۔ روپے یا سرمائے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ "بے چین" رہتا ہے۔ اور برابر بڑھتا رہتا ہے۔ کوئی کارخانہ دار ایک ہی کارخانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ مزید کارخانے لگانے کی فکر میں رہتا ہے۔ پھر بڑے بڑے کارخانہ دار مل کر اجارہ داریاں قائم کر لیتے ہیں اور ملکی معیشت پر چھا جاتے ہیں۔ اشتمالی نظامِ معیشت میں ذرائع پیداوار عوام کے قبضے میں چلے جاتے ہیں اور اراضی اور کارخانے مشترکہ ملکیت بن جاتے ہیں جس سے استحصال کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ طبقاتی تفریق مٹ جاتی ہے۔ پیداواری علائق دوستانہ ہو جاتے ہیں اور صحیح معنوں میں معاشی اور سماجی مساوات قائم ہو جاتی ہے۔ کارخانوں میں جو بھی قدر زائد یا منافع پیدا کیا جاتا ہے وہ کسی فرد کو نہیں ملتا بلکہ عوام پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ شخصی املاک اور استحصال کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے جہاں شخصی املاک نہیں ہوں گی وہاں کسی کا استحصال بھی نہیں ہوگا۔ زائد قدر کے معاشی قانون کا انکشاف کارل مارکس کا ایک گراں قدر فکری کارنامہ ہے۔ جس نے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی لوٹ کھسوٹ کو بے نقاب کیا اور جس سے محنت کشوں کے دلوں میں جبر و استحصال کو ختم کرنے کا ولولہ پیدا ہوا۔

انحرافات

کارل مارکس کا فلسفہ ایک مکمل فکری نظام ہے۔جس میں انقلابی جدوجہد بھی مشمول ہے مخالفین اسے منطقی پہلو سے آج تک رد نہیں کر سکے اس لیے اس میں ترمیم یا بزعمِ خود اصلاح کر کے اسے مسخ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ان کا مقصد یہ ہے کہ مارکسیت سے انقلابی عمل اور طبقاتی آویزش کو خارج کر کے اسے کھوکھلا اور بانجھ کر دیا جائے موقع پرستی' اصلاح پسندی اور ترمیم پسندی اسی نوع کی کوششیں ہیں۔اس ضمن میں بعض اچھے خاصے دیدہ ور اصحاب فکر بھی جن کی منطقی بصیرت مسلّم ہے۔ مارکسیت کا ذکر کرتے وقت تضادات اور خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔مثال کے طور پر برٹرنڈرسل اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے:

> "میں جانتا ہوں کہ جنگ وجدال' بے رحمی' تنظیم و تادیب کے بغیر کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اجتماعی عمل کی خاطر فرد کو کل پرزہ بنانا ضروری ہو جاتا ہے لیکن اگرچہ میری عقل مجھے ان باتوں پر عقیدہ رکھنے پر مجبور کرتی ہے' پھر بھی مجھے ان باتوں سے تحریک نہیں ہوتی۔ میں انسان کی انفرادی روح سے پیار کرتا ہوں۔ اس کی تنہائی' اس کی امیدوں' اس کے خدشات' اس کے سریع الاثر جذبات' اس کی خودی' اس کی محبت سمیت اس سے پیار کرتا ہوں۔"

یہاں برٹرنڈرسل عقلیاتی اور اصولی طور پر انقلابی سرگرمیوں کی حمایت کرتا ہے لیکن اپنی عقلیت کو اپنی ذاتی پسند اور ناپسند پر قربان کر دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ محض اس کی پسند اور ناپسند کی خاطر انقلابی اجتماعی ضبط و تنظیم کو ترک کر دیا جائے۔ وہ روا روی میں اس

حقیقت سے بھی صرف نظر کر لیتا ہے کہ تنظیم و تادیب...... یاد رہے کہ انگریزوں کی تادیب پسندی مشہور زمانہ ہے...... سے کوئی فرد کل پرزہ نہیں بن سکتا بلکہ ایک تعمیری اور تخلیقی فریضہ سرانجام دیتا ہے جو معاشرے کا فرد ہونے کے ناطے اس پر عائد ہوتا ہے۔ برٹرنڈ رسل چاہتا ہے کہ کسی فرد کی ذاتی امیدوں' خودی اور تنہائی کے نام پر تعمیری اجتماعی تحریکوں کے سامنے بند باندھ دیا جائے اور وہ اس جیسے کھاتے پیتے نام نہاد آزاد خیال[1] لوگ یہ بات نہیں سمجھ پاتے کہ یہ شخصی امیدیں خودی خدشات اور محبت ان کی اپنی ذات تک محدود ہیں۔ ظلم و استحصال کی چکی میں پسنے والے کروڑوں محنت کش انقلاب لا کر اور عادلانہ معاشرہ قائم کر کے ہی زندگی کی مسرتوں سے بہرہ یاب ہو سکتے ہیں۔ اپنی ایک اور کتاب میں برٹرنڈ رسل لکھتا ہے:[2]

> "میں نہیں مانتا کہ بنی نوع انسان میں اس قدر سیاسی بصیرت اور رواداری موجود ہے کہ وہ رضا کارانہ طور پر عالمی حکومت قائم کر لیں گے۔ اس لیے میرے خیال میں اس کے قیام کے لیے اور اس کے بعد کچھ مدت کے لیے زور اور طاقت سے کام لینا پڑے گا۔"

مارکسی بھی تو دنیا میں عادلانہ نظامِ معاشرہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور معاشی مساوات کی بنیاد پر عالمی حکومت قائم کرنے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں ان پر بھی یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ مسلح جدوجہد اور انقلابی کشمکش...... زور اور طاقت...... کے بغیر ہمہ گیر جبر و استحصال کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اور انگریز فلسفی سی' ای' ایم جوڈ لکھتا ہے:[3]

> "میرے خیال میں مارکسیوں کا یہ خیال درست ہے کہ سرمایہ داروں کے استحصال کے راستے میں جو رکاوٹیں حائل ہیں۔ انہیں جدوجہد کے بغیر دور نہیں کیا جا سکتا لیکن اس جدوجہد سے دامن بچانا بہرحال ضروری ہے اگر اس سے بچنے کے لیے ہمیں اشتراکیت کو ناممکن العمل سمجھنا پڑے تو ہمیں اشتراکیت کے بغیر ہی گذر بسر کر لینا چاہیے۔"

---

1. Liberals
2. New Hopes for a Changing World
3. The Book of Joad

آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہو تو کیسے کیسے ذہین اور صاف دماغ لوگ فریب نفس میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ تو وہی بات ہوئی کہ آلڈس ہکسلے کے بقول معاشرتی امن و امان اور معاشی مساوات کی فضا میں "اعلیٰ ادب و فن" پنپ نہیں سکتے لہٰذا موجود سرمایہ دارانہ استحصالی معاشرے کو بحال رکھنا ضروری ہے۔ یہی المیہ تمام آزاد خیال انگریزوں کا ہے۔ فیبین انجمن [1] کے بورژوا دانش ورسڈنے اور بیاطر یچ ویب، ریمزے میکڈانلڈ اور جارج برنارڈ شا بھی محنت کشوں کی عملی جدوجہد کے مخالف تھے اور کہتے تھے کہ درجہ بدرجہ اصلاحات کے نفاذ سے سرمایہ دارانہ نظام سے اشتمالی نظام معاشرہ تک ارتقاء ہونا چاہیے کیونکہ انقلاب سے گڑبڑ پھیل جاتی ہے۔

بعض ایسے لوگ بھی جو بظاہر مارکسیت کا دم بھرتے ہیں۔ معاشی اصلاحات نافذ کر کے اشتمالی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اصطلاح میں اس رویے کو اصلاح پسندی [2] کا نام دیا گیا ہے۔ اصلاح پسند طبقاتی کش مکش اور اشتمالی انقلاب کے ناگزیر ہونے کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام خود بخود "رفاہی معاشرے" میں بدل جائے گا ان کا تعلق ترمیم پسندوں سے بنتا ہے۔ یہ لوگ شخصی املاک کو بحال رکھتے ہوئے معاشی عدل و انصاف کو قائم کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بدلے ہوئے حالات میں مارکس کی جدلیات فرسودہ ہو چکی ہے اور اشتمالی معاشرے کا ناگزیر قیام محض فسون و فسانہ ہے۔ آج کل اصلاح پسند کھلم کھلا اشتمالیت کی مخالفت کر رہے ہیں اور ریاستی اجارہ داری اور سامراجیوں کی جارحانہ مہم جوئی کی حمایت کر رہے ہیں۔ وہ جدید معاشی اصولوں کے نام پر محنت کشوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور مغربی جمہوریت اور اشتمالیت کے تال میل کا راگ الاپ رہے ہیں۔ اصلاح پسند حکام وقت کے حقوق کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کے اقتدار کو بحال رکھنے کے متمنی ہیں۔ وہ انقلابی جدوجہد سے اس لیے منع کرتے ہیں کہ اس سے مقتدر طبقے کی طاقت کو ضعف پہنچتا ہے۔ وہ کامل معاشی مساوات کے منکر ہیں اور محنت کشوں کو سرسری مراعات دے کر مطمئن کر دینا چاہتے ہیں اور وطن و قوم کے نام پر استحصال کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طبقاتِ معاشرہ کے مابین صلح و آشتی کی فضا کو بحال رکھنا ضروری ہے اور سرمایہ داروں کے ساتھ تعاون کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

---

1. Fabian Society
2. Reformism

مارکسیت کے خلاف موقع پرستی[1] کے ایک اور رجحان کو ترمیم پسندی[2] کہا جاتا ہے۔ اس کی رو سے مارکس کی انقلابیت اور انقلاب لانے کے طریقوں میں ترمیم کرنا ضروری ہے۔ یہ رجحان انیسوی صدی کے اواخر میں رونما ہوا جب مارکس کی تعلیمات مقبول ہو کر ہر کہیں محنت کشوں کو روح کی گہرائیوں تک متاثر کر رہی تھیں۔ اس کے ترجمانوں میں برنشٹائن اور کارل کاؤتسکی پیش پیش تھے۔ آسٹریا میں ایف ایڈلر اور اوبائر اور روس میں منشویک ترمیم پسند تھے۔ بعد میں ٹراٹسکی اور بخارن نے اس کی ترجمانی کی۔ یہ لوگ مارکسیت میں بورژوازی کے خیالات کو شامل کر کے محنت کشوں کو گمراہ کرنا چاہتے تھے اور ان کے قلب و جگر میں انقلابی جوش و خروش کو سرد کرنے کے متمنی تھے۔ آج کل کے بورژوازی ٹریڈ یونینوں کے رہنماؤں کو بھاری رقمیں رشوت میں دے کر ان سے پرولتاریہ کو گمراہ کرنے کا جو کام لے رہے ہیں وہ اسی ترمیم پسندی سے یادگار ہے۔ ان لوگوں نے مارکسیت کے پردے میں انقلابی تحریکوں کو بے حد و غایت نقصان پہنچایا ہے۔

ترمیم پسندی کے بانی ایڈورڈ برنشٹائن نے جو ایک جرمن سوشل ڈیموکریٹ تھا۔ کارل مارکس کے سائنٹفک سوشلزم کے خلاف قلم اٹھایا اور مارکس کے نظریات میں ترمیم کرنے کی دعوت دی۔ وہ مارکس کی مادیت میں کانٹ کی مثالیت کو مخروج کرنا چاہتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ سوشلزم کوئی سائنٹفک نظریہ نہیں ہے بلکہ محض ایک اخلاقی نصب العین ہے۔ وہ پرولتاریہ کی آمریت کا بھی منکر تھا اور کہتا تھا کہ مرور زمانہ سے طبقاتی آویزش خود بخود دم توڑ جائے گی۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام کی حدود میں رہ کر ٹریڈ یونینوں کے واسطے سے اصلاحِ معاشرہ کی جانب قدم بڑھایا جائے۔ پلیخانوف نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور اس کی کتابوں پر بصیرت افروز نقد لکھا۔ برنشٹائن نے موقع پرستی کو بھی تقویت دی اور مارکسیت کی عامیانہ تشریح کر کے مزدوروں کو انقلابی سرگرمیوں سے باز آ جانے کی تلقین کی۔ اس کی پیروی میں آج کل کے امریکی دانشور کہہ رہے ہیں کہ ریاست کے معیشت میں دخل و تصرف سے سرمایہ داری نظام کی ماہیت بدلتی جا رہی ہے لہٰذا اب انقلابی سرگرمیوں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ دوسرے بڑے ترمیم پسند کارل کارٹسکی نے مارکس اور انجلز سے ملاقاتیں کیں اور اپنی کتابوں میں مارکس کے افکار کی ترجمانی بھی کی لیکن اس

1۔ Opportunism　2۔ Revisionism

کے ساتھ کئی پہلوؤں سے مارکس کی تعلیمات کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ وہ بھی انقلابی تحریک کو غیر ضروری سمجھتا تھا اور پرولتاریہ کی آمریت کا مخالف تھا۔ اس نے مارکس کی کامل مادیت سے انکار کیا اور مارکسیت میں مثالیت کو شامل کر کے انقلابی عمل کو ضرر پہنچانے کی کوشش کی۔

تحکم پسندی[1] کا رجحان بھی مارکسیت سے انحراف کی ایک اندیشہ ناک صورت ہے۔ تحکم پسند مارکس کے نتائج فکر کو اٹل سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں مارکس کا فلسفہ نقد و جرح سے ماوراء ہے اور مارکس نے سیاسی و معاشی اور سماجی مسائل پر جو کچھ بھی کہہ دیا ہے وہ حرف آخر ہے۔ وہ مارکس اور لینن کی اندھا دھند تقلید کرنے پر مصر ہیں اور ان کے افکار کو ازلی و ابدی صداقتیں مانتے ہیں جو بدلتے ہوئے احوال سے بالاتر ہیں اس لیے وہ بدلتے ہوئے سیاسی و معاشی احوال کے نئے نئے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ کارل مارکس خود تحکم پسندی کو ناپسند کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اس کا نظریہ مثالیاتی نہیں ہے بلکہ ایک عمل ہے' تحریک ہے جس سے موجودہ نامنصفانہ سماجی نظام کو بدلنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ایک دن اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس نے مزاحاً کہا کہ میں مارکسی نہیں ہوں۔ لینن نے اس بارے میں لکھا:

> "ہم مارکس کے نظریئے کو قاطع و مانع نہیں سمجھتے۔ ہمارے خیال میں مارکس نے اس سائنس کی بنیاد رکھ دی ہے۔ جسے اشتراکیت پسندوں نے رواج و قبول دیا ہے تاکہ وہ زندگی کے ساتھ ہم قدم ہو سکیں۔ ہمارے خیال میں روسی اشتراکیوں پر لازم ہے کہ وہ مارکس کے نظریئے کی آزادانہ ترجمانی کریں اس کے نظریئے میں رہنمائی کے عام اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جو انگلستان' فرانس' جرمنی' روس کہیں بھی اپنی خصوصیات میں مختلف طریقوں سے اپنائے جا سکتے ہیں۔"

ان الفاظ میں لینن نے شخص تحکم پسندی کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور مارکسیت کی تخلیقی ترجمانی کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس کے خیال میں مارکس کے فکر کے بنیادی اصولوں کو درست مان کر ان کی تعمیری ترجمانی کرنا انسب ہوگا۔ یہ ترجمانی مختلف

[1] Dogmatism

اقوام میں مختلف صورتِ احوال کے تحت مختلف انداز میں کی جا سکتی ہے۔ اس سے مارکسیت کے اصل اصول مجروح نہیں ہوتے بلکہ انہیں تقویت ہوتی ہے۔ تحکم پسند اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر کر لیتے ہیں کہ کارل مارکس اور لینن سے بھی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں اگرچہ یہ غلطیاں نظریاتی نہیں تھیں بلکہ اطلاق اور ترجمانی سے متعلق تھیں۔ کارل مارکس نے کہا تھا کہ اشتمالی انقلاب تمام صنعتی ممالک میں بیک وقت برپا ہوگا اور لینن نے کہا تھا کہ جب تک سرمایہ دارانہ نظام باقی ہے جنگ و جدال ناگزیر ہے۔ روسی انقلاب نے مارکس کے اور پرامن بقائے باہمی کے تصور نے لینن کے اندازے اور تجزیئے کو غلط ثابت کر دکھایا۔

یاد رہے کہ مارکسیت کی آزادانہ ترجمانی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے اصل اصول مجروح کر دیئے جائیں جیسا کہ موقع پرستوں' ترمیم پسندوں' اصلاح پسندوں اور تحکم پسندوں کا شیوہ ہے کیونکہ اصل اصول میں ترمیم یا اصلاح کرنے سے سارا نظامِ فکر ہی منہدم ہو جاتا ہے۔ یہ بنیادی اصول درج ذیل ہیں۔

1- مادہ شعور پر مقدم ہے۔ شعور مادے ہی کی ایک صورت ہے اور مادہ ذہن و شعور سے آزادانہ اپنی ذات میں موجود ہے۔
2- مادے کا عکس ذہن پر پڑتا ہے جس سے مادے اور ذہن میں جدلیاتی ربط و تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔
3- عالم مادی اور معاشرہ انسانی میں حرکت و تغیر کے اسباب وہ اضداد ہیں جو اشیاء اور اعمال کے بطون میں موجود ہیں۔
4- نیچر کی طرح معاشرے میں بھی معروضی قوانین کارفرما ہیں جنہیں بدل دینے سے ہم قاصر ہیں البتہ ان کی ماہیت کے وقوف سے ہم ان سے حسبِ منشا کام لے سکتے ہیں اور اس طرح جبر میں اختیار کو پا لیتے ہیں۔
5- مادی احوال یعنی پیداواری قوتیں' پیداواری وسائل اور پیداواری رشتے مل کر وجود بناتے ہیں جب کہ سیاسیات' معاشیات' اخلاقیات' ادبیات وغیرہ اس کی بالائی شعوری عمارت بناتے ہیں۔ پیداواری قوتوں اور پیداواری وسائل کے بدل جانے سے سیاسی' معاشی' اخلاقی اور سماجی قدریں بھی بدل جاتی ہیں۔

6- سرمایہ داری نظام میں محنت کش کارخانوں میں زائد قدر پیدا کرتے ہیں جو منافع کی صورت میں بیکار کارخانہ دار کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ یہ استحصال کی بدترین صورت ہے۔ پیداواری وسائل پر قبضہ کیے بغیر نہ اس استحصال کا خاتمہ ممکن ہو سکتا ہے نہ معاشی اور سماجی مساوات قائم کی جا سکتی ہے۔

7- سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام جبر و تشدد پر قائم ہے۔ اس لیے اس کا استیصال جبر و تشدد ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ زبانی کلامی پند و نصیحت یا بتدریج اصلاحات کے نفاذ سے اشتمالی معاشرے کا قیام ممکن نہیں ہے۔

مندرجہ بالا بنیادی اصول کی روشنی میں کسی بھی ملک و قوم کی مخصوص سیاسی، معاشی اور سماجی روایات و احوال کے مدنظر موجودہ صورتِ احوال کا معروضی تجزیہ کر کے ہی ثمر آور انقلابی اقدام کیا جا سکتا ہے۔

لینن

لینن (اصل نام ولادمرالچ الیانوف) ۱۰/ اپریل 1870ء کو سمبرسک کے ایک روشن خیال گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ الیانکولیوچ الیانوف نے افلاس کی کڑیاں جھیلتے ہوئے کاذان یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور ایک مدرسے میں ریاضی اور طبیعیات پڑھانے لگا۔ لینن کے ماں باپ نہایت وسیع النظر خردمند تھے۔ انہوں نے بڑی تندہی سے اپنے بچوں کی تربیت کی۔ چنانچہ بڑے ہو کر لینن سمیت سب بہن بھائیوں نے انقلابی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لینن کے لڑکپن کا واقعہ ہے کہ ایک دن ایک مہمان سے باتیں کرتے ہوئے لینن کا باپ کہنے لگا۔

"میرے بچے گرجا کا رخ نہیں کرتے۔"

مہمان نے لینن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بید سے اس کی خوب ٹھکائی کرو۔"

یہ سن کر لینن غصے سے بے تاب ہو گیا۔ اس نے اپنے گلے سے لٹکی ہوئی صلیب نوچ کھسوٹ کر پرے پھینک دی اور بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

لینن بچپن سے ہی ایک نہایت ذہین اور محنتی طالب علم تھا۔ اس نے اپنے مدرسے کے آخری امتحان میں سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اس کے بڑے بھائی الیگزینڈر کو حکومت نے انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں موت کی سزا دی تو لینن نے عہد کیا کہ وہ اس ظلم و تشدد کا خاتمہ کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔ لینن نے سترہ برس کی ہی عمر میں انقلابی کام شروع کر دیا اور بڑے غور سے مارکسی ادب کا مطالعہ کیا۔ مارکس کے افکار کو

نکولائی فیدریف نے طلبہ میں رواج و قبول دیا تھا اور ایک خفیہ حلقہ بنا کر طالب علموں کو مارکسیت کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ مارکس کی کتابوں کے مطالعے سے لینن پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ مارکس کے اصولوں پر کاربند ہو کر ہی جبر و استحصال کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ کازان یونیورسٹی میں وہ طلبہ کی انقلابی سرگرمیوں کا روح رواں بن گیا۔ جب پولیس نے اسے گرفتار کیا تو ایک افسر لینن سے کہنے لگا:

"نوجوان! بغاوت کر کے کیا لو گے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے سامنے ایک دیوار کھڑی ہے۔"

لینن نے برجستہ کہا:

"لیکن یہ دیوار اندر سے بودی اور شکستہ ہے۔ اسے بس ایک ہی دھکے کی ضرورت ہے۔"

جنوری 1892ء میں لینن نے قانون کی سند لی لیکن وکالت کرنے کی بجائے اس نے اپنے آپ کو ہمہ تن انقلابی کام کے لیے وقف کر دیا۔ اسی سال اس نے مارکسی حلقے کی بنیاد رکھی جس کے اراکین پرجوش انقلابی تھے۔ سینٹ پیٹرز برگ میں لینن نے وکالت کے پردے میں مزدوروں کی تنظیم کا کام شروع کیا۔ ان کی سیاسی تربیت کے لیے دن رات محنت کرنے لگا۔ اس نے مزدوروں کی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ ان میں اپنے مقام کا شعور پیدا کیا۔ اسے مارکس کا یہ قول یاد تھا کہ مزدور تمام محنت کشوں کے ہراول دستے کا کام دیتے ہیں۔ اس مہم کے دوران اس کی ملاقات ایک خردمند انقلابی خاتون کرپس کایا سے ہوئی جو مزدوروں کے ایک مدرسے میں پڑھاتی تھی۔ 1893ء میں لینن کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ جہاں اسے شوشن شکوئے کے مقام پر نظر بند کر دیا گیا۔ اس دوران میں کرپس کایا کو بھی جلاوطنی کی سزا دی گئی اور اس کی درخواست پر اسے لینن کے پاس بھیج دیا گیا۔ جہاں 1898ء میں ان کا بیاہ ہوا۔ جلاوطنی کے ان ایام میں لینن نے فلسفے کا مطالعہ کیا۔ جس کا آغاز ہولباخ، ہلویشیس اور کانٹ کی کتابوں سے ہوا۔ 1900ء کے آغاز میں وہ سزا بھگت کر واپس آیا تو اسے سینٹ پیٹرز برگ یا کسی دوسرے شہر میں رہائش اختیار کرنے کی ممانعت کر دی گئی چنانچہ وہ ایک نواحی قصبے میں رہنے سہنے لگا۔ خفیہ پولیس والوں کی تعدی سے بیزار ہو کر وہ جرمنی چلا گیا جہاں اس نے اپنا جریدہ اسکرا (شرر) جاری کیا۔

1912ء میں وہ اس جریدے کو لندن لے گیا۔ اس پرچے میں لینن نے زور دار مضامین لکھے اور محنت کشوں کے مسائل کی جانب عوام کی توجہ دلائی۔ ایک مضمون میں لکھا:

"ہم ایک بہتر اور نیا نظام معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس نئے معاشرے میں امیر اور غریب کی تفریق مٹ جائے گی اور سب لوگوں کو کام کرنا پڑے گا۔ محنت کا ثمر گنتی کے چند لوگوں کی جیب میں نہیں جائے گا بلکہ سب لوگ اس اجتماعی محنت کا پھل پائیں گے۔ ہمیں کلوں اور دوسرے ترقی یافتہ وسائل سے جملہ عوام کی آسائش کا سامان کرنا ہے۔ چند لوگوں کو ہزاروں لاکھوں محنت کشوں کی کمائی سے دولت سمیٹنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ نیا اور بہتر معاشرہ اشتراکی معاشرہ کہلائے گا۔ اس کی تعبیر و تعلیم کا نام اشتراکیت ہے۔"

لینن نے مارکسیت کی اشاعت کا کام بڑے انہماک سے جاری رکھا۔ وہ کہتا تھا کہ انقلابی نظریے کے بغیر کوئی انقلابی تحریک بارآور نہیں ہو سکتی۔ اس کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ تھا کہ پرولتاریہ کی آمریت کے قیام سے ہی استحصال کا کامل انسداد ممکن ہو سکتا ہے اور انقلابی تحریک کو مزدوروں اور کسانوں کے اتحاد ہی سے کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ پارٹی کی دوسری کانگرس منعقدہ 1903ء میں لینن کے حامیوں کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ جس سے ان کا نام بالشویک پڑا (لغوی معنی اکثریت والے) اور مخالف دھڑے کا نام منشویک (اقلیت والے) پڑ گیا۔

دسمبر 1905ء میں ماسکو کے مزدوروں نے مسلح بغاوت کی جو کسانوں تک پھیل گئی لیکن زار شاہی نے اسے سختی سے کچل دیا اور لینن کو دوبارہ ترک وطن کرنا پڑا۔ 1907ء اور 1910ء کے درمیانی سالوں میں انقلاب پسندوں پر بے پناہ ستم توڑے گئے لیکن لینن پورے اعتماد سے تنظیمی کام کرتا رہا۔ پلیخانوف نے جو مارکسیت کا ایک سربرآوردہ ترجمان تھا' کہا کہ محنت کشوں کی مسلح بغاوت خواہ ناکام ہو جائے بہرصورت ان کی تربیت کا باعث ہوتی ہے۔ ایک دوسرے موقع پر کاؤتسکی نے مغربی طرز کی جمہوریت اختیار کرنے کی دعوت دی لیکن لینن نے جواباً کہا کہ سوشلزم مغربی جمہوریت کا ہی آخری مرحلہ ہے اور پرولتاریہ کی آمریت اس بلند تر جمہوریت کی ایک صورت ہے۔ جس سے استحصال کا خاتمہ کر دیا

جاتا ہے۔ یہ ایک اہم انکشاف تھا جس کی روشنی میں انقلاب اکتوبر کے بعد روس میں سوشلزم کی تعمیر و استحکام کا کام لیا گیا۔ لینن کا دوسرا انکشاف یہ تھا کہ سامراج کے عروج کے ساتھ معاشی و سیاسی حالات بدل گئے ہیں' اس لیے مارکس کے قول کے برعکس سوشلزم کو کسی ایک ہی ملک میں خواہ وہ صنعت کاری کے پہلو سے کتنا ہی پسماندہ کیوں نہ ہو' کامیابی سے نافذ کیا جا سکتا ہے۔ بعد میں لینن کے اس خیال کو سٹالن نے باقاعدہ ایک منطقی نظریہ بنا دیا۔

1912ء میں بالشویکوں نے سینٹ پیٹرز برگ سے ایک جریدہ پراودا (سچ) نکالا جس میں لینن نے تواتر و تسلسل سے لکھنا شروع کیا اور اس کے انقلابی خیالات کی گونج ملک کے کونے کونے سے سنائی دینے لگی۔ پراودا میں لینن نے 1912ء اور 1914ء کے درمیانی سالوں میں دو سو اسی مضامین لکھے۔ 1914ء میں پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوگئی اور لینن نے کہا اس کا اصل مقصد نو آبادیوں کی تقسیم ہے جس سے سامراجی طاقتوں میں رقابت پیدا ہوگئی ہے اور وہ وطنیت کے نام پر لاکھوں محنت کشوں کو موت کی آگ میں دھکیل رہے ہیں۔

کم و بیش دس برس کی جلاوطنی کے بعد لینن 3/اپریل 1917ء کو پیٹروگراڈ پہنچ گیا جہاں انقلاب پسندوں نے بڑے جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا لیکن عبوری حکومت نے اس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا۔ لینن روپوش ہوگیا اور فائرمین کا بھیس بدل کر ریلوے کے انجن میں فن لینڈ چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد وہ لوٹ آیا اور اس کی جماعت نے مسلح بغاوت سے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اکتوبر کا عظیم اشتراکی انقلاب برپا ہوا۔ جس سے تاریخ عالم میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

لینن نے کہا:

> ''ہم اپنی اس اولیت پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ ہم نے کرۂ ارض کے ایک حصے میں سرمایہ داری کے درندے کو کچل کر رکھ دیا ہے جس کی خونریزی سے پوری دنیا لالہ زار بن گئی ہے۔ جس نے بنی نوع انسان کو بھوکوں مارا ہے اور جس نے عوام کے اخلاق کو پست کر دیا ہے۔''

دنیا بھر کے انسان دوست دانشوروں نے انقلاب روس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔

فرانس کے عظیم ناول نگار اور موسیقار رومیں رولاں نے لکھا:

"میں ہمیشہ حرکت کا قائل رہا ہوں۔ میں نے ان لوگوں کے لیے لکھا ہے جو منزل کی تلاش میں رواں دواں ہیں صرف موت ہی میرا راستہ روک سکتی ہے میرے لیے زندگی بے معنی ہوتی اگر یہ حرکت اور پیش رفت سے عاری ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام کے ساتھ ہوں۔ ان لوگوں کا ہم نوا اور ہمدم ہوں جو بنی نوع انسان کے لیے نئی نئی راہیں روشن کر رہے ہیں۔ میں منظم پرولتاریہ کے ساتھ ہوں' سوویت روس کے ساتھ ہوں جنہیں تاریخ کے دھارے آگے آگے لیے جا رہے ہیں۔"

لینن نے محنت کشوں کے حقوق کا اعلان لکھا جو بعد میں سوویت آئین کی بنیاد بن گیا۔ انقلاب روس کے بعد یورپ کی سامراجی طاقتوں نے متحد ہو کر سوویت روس پر چاروں طرف سے یلغار کر دی لیکن لینن کی ولولہ انگیز قیادت میں کسانوں اور محنت کشوں کی فوجوں نے رد انقلاب کو ناکام بنایا۔ لینن نے سوویت روس کی صنعتی اور معاشی ترقی کے لیے ایک عظیم منصوبے بنائے لیکن انہیں پروان چڑھانے کا موقع انہیں نہ مل سکا۔ 30/ اپریل 1918ء کو ایک دہشت پسند عورت فینی نے قریب کھڑے لینن پر طپنچہ جھونک دیا۔ زہر میں بجھی ہوئی ایک گولی لینن کے کندھے میں اور دوسری بائیں پھیپھڑے میں لگی۔ جب ڈاکٹر ان کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے تو لینن نے مسکرا کر کہا:

"کوئی بات نہیں' انقلابیوں کو ایسے حالات پیش آیا ہی کرتے ہیں۔"

ڈاکٹروں کی کوششوں کے باوجود اس کے پھیپھڑے سے گولی نکالی نہ جا سکی لیکن وہ کچھ روز صاحب فراش رہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے تعمیری اور تنظیمی کام میں جت گیا۔ وہ کئی برس اپنی طویل اور دردناک علالت کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بعد 21/ جنوری 1924ء کو ابدی نیند سو گیا۔ اس کی موت سے دنیا بھر کے محنت کشوں میں غم والم کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے اوزار رکھ دیئے' کام بند کر دیا اور اپنی اپنی جگہ چپ چاپ سرنگوں کھڑے ہو کر گھٹی گھٹی سسکیوں اور چھلکتے ہوئے آنسوؤں سے اپنے عظیم دوست اور رہنما کو غائبانہ خراج عقیدت پیش کیا۔ لینن نے اپنے اس قول کو سچا کر دکھایا کہ زندگی ایک نہایت قیمتی متاع ہے۔ اسے

کسی عظیم نصب العین کے لیے وقف کر کے ہی احسن طریقے سے گذارا جا سکتا ہے۔

"لینن کا مسلک" بدلتے ہوئے تاریخی اور معاشی احوال میں مارکس اور انجلز کے نظریات کی تعمیری اور تخلیقی ترجمانی ہی کا دوسرا نام ہے اور کوئی بھی شخص لینن کی اس ترجمانی کو قبول کیے بغیر مارکسی کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

لینن کی فلسفیانہ دین بھی گرانقدر ہے۔ جدید طبیعیات کے انکشافات کی تشریح کرتے ہوئے ماخ اور ایونیرس نے کہا کہ مادے کے ٹھوس ہونے کا تصور باطل ہو گیا ہے اور مادہ توانائی کی لہروں میں تحلیل ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے مادیت اور جدلی مادیت کے نظریات بھی باطل ہو گئے ہیں۔ لینن نے ان تعریضات [1] کا محققانہ تجزیہ کیا اور ثابت کیا کہ توانائی کی لہروں میں تحلیل ہونے کے انکشافات کے باوجود مادہ اپنی معروضی حیثیت میں موجود ہے یعنی وہ اپنے وجود کے لیے کسی موضوع یا شعور کا محتاج نہیں لہٰذا جدلیاتی مادیت کی بنیادیں بدستور محکم ہیں اور مارکس کے نتائج فکر بدستور سالم و ثابت ہیں۔ فریڈرک ہیئر نے لینن کے اس استدلال کو جدید فلسفے کا ایک عظیم اجتہاد قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس نے مثالیت اور سریت کو رد کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ معروضی عالم پر تعمق کرنے سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ نیچر کے قوانین کو ذہن نشین کر کے ان سے انسانی فلاح و بہبود کا کام لیا جائے۔ یہ کہہ کر لینن نے مارکس کی جدلیاتی مادیت کا اثبات سائنس کے جدید ترین انکشافات سے کیا ہے جو اس کی فلسفیانہ بصیرت کا ایک روشن ثبوت [2] ہے۔

---

1. Materialism and Empirio-Criticism
2. History of Modern Philosopy

ماؤزے تنگ

ماؤزے تنگ 26 دسمبر 1893ء کو شاؤ شان کے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک غریب کسان تھا جو چھوٹا موٹا کاروبار بھی کر لیتا تھا۔ ماؤ پانچ برس کی عمر میں کھیتوں میں کام کرنے لگا۔ سات برس کی عمر میں اسے مدرسے میں داخل کروایا گیا۔

جہاں وہ پانچ سال کنفیوشس کی کتابیں پڑھتا رہا۔ شروع سے ہی وہ دل دردمند رکھتا تھا۔ جب کبھی اس کے ہاتھ میں نقدی آجاتی وہ اسے غریب کسانوں میں بانٹ دیا کرتا تھا جس سے اس کا باپ سخت نالاں تھا۔ چودہ برس کی عمر میں اس کا بیاہ اپنی عمر سے چھ برس بڑی لڑکی سے کر دیا گیا لیکن ان کی نبھ نہ سکی۔ مانچو شاہی کے خلاف 1912ء میں بغاوت ہوئی تو ماؤ نے اپنی بالوں کی لٹ منڈوا دی جو غلامی کا نشان سمجھی جاتی تھی۔ چانگ شو میں ماؤ نے آدم سمتھ، جے ایس مل، موں تسکو، روسو اور لیو ٹالسٹائی کی کتابوں کا بنظرِ غور سے مطالعہ کیا۔ 1918ء میں اسے پیکنگ یونیورسٹی کے کتب خانے میں نائب لائبریرین کی آسامی پر تعینات کیا گیا۔ یہاں کا لائبریرین لی تا چاؤ تھا جو مستعدی سے چین میں کارل مارکس کے افکار کی اشاعت کر رہا تھا۔

ماؤ بھی مارکسٹ سٹڈی گروپ میں شامل ہو گیا اور چن تو سین کا رفیق بن گیا جو ایک پرجوش مارکسی انقلابی تھا۔ 1920ء میں ماؤ نے انقلابی منشور پڑھا اور دل و جان سے مارکس کا پیرو بن گیا۔ انہی ایام میں اس نے اپنے استاد لی تا چاؤ کی بیٹی سے شادی کر لی۔

چین کی تاریخ میں 12-1911ء کا انقلاب ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کومنتانگ پارٹی کے مشہور رہنما سن یات سن نے مانچو شاہی کا تختہ الٹ کر جمہوریہ چین کا

اعلان کر دیا۔ سن یات سن اوائل عمر ہی سے مانچو شاہی سے نفرت کرتا تھا۔ اس کا لڑکپن تھا کہ ایک دن شاہ مانچو کے کچھ سپاہی آ گئے اور اس کے تین پڑوسیوں کو پکڑ کر لے گئے۔ سن نے اپنے باپ سے پوچھا:

''ابو! ہمارے پڑوسیوں کا کیا بنا؟''

''ان کے سر قلم کر دیئے گئے ہیں بیٹا!''

''کس جرم میں؟''

''جرم یہ ہے کہ وہ امیر کبیر تھے۔ شاہ مانچو ان کی املاک ہتھیانے کے لیے انہیں اپنی راہ سے ہٹانا چاہتا تھا۔''

جمہوری انقلاب کے بعد سن یات سن نے اپنی پارٹی کے لیے تین اصول وضع کیے۔

1- روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات۔
2- اشتمالیوں کے ساتھ تعاون۔
3- کسانوں اور مزدوروں کے مفادات کا تحفظ۔

سن یات سن 1925ء میں فوت ہوا تو پارٹی کی باگ ڈور چیانگ کشیک کے ہاتھ میں آ گئی۔ یہیں سے اشتمالیوں اور چیانگ کی تاریخی نزاع کا آغاز بھی ہوا۔ اکتوبر کے روسی انقلاب نے دوسرے ممالک کی طرح چین کو بھی متاثر کیا اور چین کے ترقی پسند نوجوان انقلابی تحریک کی لپیٹ میں آ گئے۔ ان میں ماؤزے تنگ' چو این لائی' لی لی سان چن ژی' تنگ ہسیاؤ پنگ ممتاز مقام کے حامل تھے۔ 1920ء میں پیکنگ اور شنگھائی میں کیمونسٹوں کی تنظیم کا کام زور شور سے ہونے لگا۔ کیمونسٹ انٹرنیشنل نے ایک دانشور وائی ٹنکی کو چین میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ جولائی 1921ء میں کیمونسٹ پارٹی کی بنیاد کنگ چان تانگ (دولت کے اشتراک کی ایک جماعت) کے نام سے رکھی گئی۔ اس اجلاس میں بارہ مندوبین نے شرکت کی' جن میں ماؤزے تنگ بھی شامل تھے۔ چیانگ کشیک کی پشت پناہی مغرب کے سامراجی اور سرمایہ دار ممالک کر رہے تھے کیونکہ وہ چین کا معاشی استحصال کرنے کے لیے ہر قیمت پر اسے اشتمالی انقلاب سے بچانا چاہتے تھے۔ لینن نے ان کے عزائم کے بارے میں بھی کہا تھا:

"مغرب کے لگڑ بگڑ چین پر اپنے دانت نکوسے کھڑے ہیں۔"

چیانگ کیشک کمیونسٹوں کو اپنے ذاتی اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتا تھا چنانچہ اس نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپریل 1927ء کو شنگھائی میں کمیونسٹوں کا قتلِ عام کروایا۔ سینکڑوں کمیونسٹ چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ان کے رہنما بڑی مشکل سے جانیں بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

چین کی تاریخ میں کسان قدیم زمانے سے مؤثر کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ ان کی بغاوتوں نے کئی بادشاہتوں کے تختے الٹے ہیں۔ ماؤزے تنگ چینی تاریخ کے باغی کسانوں کی قربانیوں سے بہت متاثر تھا۔ مارکسی فکر و عمل میں اس کی یہ دین نہایت قابلِ قدر ہے کہ اس نے کسانوں کے انقلابی کردار کا انکشاف کیا۔ اس کے اپنے صوبے کے کسان بڑے ستم رسیدہ تھے۔ ماؤ نے ان کی تنظیم سے اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ 1927ء میں اس نے ہونان کے کسانوں کی تحریک پر اپنی مشہور رپورٹ لکھی جس سے اس کی سیاسی بصیرت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے:

> "ایک قلیل عرصے میں چین کے مرکزی' جنوبی اور شمالی صوبوں کے کروڑوں کسان ایک طوفان بن کر اس زور شور سے اٹھیں گے کہ ان کے ریلے کو کوئی بھی طاقت خواہ وہ کتنی بھی بڑی ہو روک نہیں سکے گی۔ کسان ان تمام بندھنوں کو توڑ کر جن میں وہ فی الوقت جکڑے ہوئے ہیں' آزادی کی راہ پر نکل کھڑے ہوں گے۔"

انقلاب چین کے بعد ماؤزے تنگ نے کہا تھا کہ اس انقلاب میں کسانوں کا حصہ ستر فی صد ہے اور شہری مزدوروں اور فوج دونوں کا تیس فیصد۔ اس نے کہا:

> "اگر انقلاب صرف مزدور ہی لا سکتے تو ہم کبھی انقلاب برپا نہ کر سکتے۔"

پھر کہا:

> "کسانوں کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی بقاء کے لیے لڑ رہے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار انہیں ایک عظیم نصب العین کے ساتھ وابستگی کا احساس ہوا۔"

انہی خیالات کی بنا پر ماؤزے تنگ اور کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں اختلافات رونما ہوئے۔ کسانوں کی تنظیم کا جو کام ماؤزے تنگ نے شروع کیا تھا۔ شہری کمیونسٹوں کو وہ بہت بُرا لگا۔ ماؤزے تنگ کی تجویز یہ تھی کہ ہونان کے زمینداروں کی املاک ضبط کر کے کسانوں کی تحویل میں دے دی جائیں۔ ایک شہری دانشور لی لی نے ماؤزے تنگ پر قدامت پسند ہونے کا الزام لگایا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ماؤ کو پارٹی کی سینٹرل کمیٹی سے نکلوا دیا۔ اس کے باوجود ماؤ اپنے نظریئے کو عملی جامہ پہنانے اور کسانوں کی مدد سے سیاسی طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پارٹی کے اراکین سے ماؤ کا اختلاف اس بات پر بھی ہوا کہ اکثر اراکین ٹراٹسکی کی حکمتِ عملی کو پسند کرتے تھے اور عالمگیر انقلاب کو اولین اہمیت دیتے تھے جب کہ ماؤ لینن کی طرح پہلے اپنے ہی ملک میں انقلاب لانے کی دعوت دیتا تھا۔ ماؤ نے کسانوں کی تحریک کے حوالے سے انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

> ''انقلابی تحریک خاص صورتِ حال میں پیدا ہوئی۔ ہم نے کسانوں کو بغاوت پر اکسایا نہیں تھا بلکہ ان کی بغاوت کو منظم کیا تھا۔ انقلاب جوشیلے جذبات کا ڈرامہ ہوتا ہے۔ ہم نے عوام کو عقل و استدلال سے قائل کر کے انہیں اپنے ساتھ نہیں ملایا بلکہ انہیں امید' اعتماد اور مساوات کا درس دیا۔ فاقہ کشی کے عالم میں مساوات کا جذبہ مذہبی جذبے کی طرح پر جوش ہوتا ہے۔''

1933ء میں چیانگ کائی شیک نے دس لاکھ فوج سے جو مغرب سے آئے ہوئے جدید ترین اسلحہ سے لیس تھی اور جرمن جرنیلوں کی تربیت یافتہ تھی۔ کمیونسٹوں کے گڑھ کیا نگسی کو گھیرے میں لے لیا۔ چار سو ہوائی جہاز اور بے شمار ٹینک بھاری توپیں اور جنگی گاڑیاں لڑائی میں جھونک دی گئیں۔ چیانگ کائی شیک جرمن جرنیلوں فان سیکٹ اور فان فاکن ہاسن کے مرتب کیے ہوئے جنگی منصوبے کے مطابق کمیونسٹوں کے گرد دائرہ تنگ تر کر کے ایک ہی ہلے میں انہیں فنا کر دینا چاہتا تھا۔ کمیونسٹوں کے صدر مقام سے ملحقہ رسل و رسائل پر قبضہ جما لیا گیا۔ جس سے کمیونسٹوں کے پڑاؤ میں نمک' کپڑے' مٹی کے تیل اور دواؤں کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ ان کے چاروں طرف نواحی علاقے کو دور دور تک اجاڑ دیا

گیا۔ کمیونسٹوں نے اپنے گرد گھیرے کو تنگ ہوتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھ کر مقابلہ کیا لیکن بھاری اسلحہ نہ ہونے کے باعث انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اب ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ یا تو وہ گھیرا توڑ کر نکل جائیں یا بیٹھے بٹھائے فنا کے گھاٹ اتر جائیں۔ آخر ماؤزے تنگ، مارشل چوہ تہہ اور چواین لائی نے اپنے پڑاؤ کو خالی کرنے کا فیصلہ کیا۔ چیانگ کیشک کے تابڑ توڑ حملوں سے خستہ وشکستہ ایک لاکھ کمیونسٹ سپاہیوں نے 16/اکتوبر 1934ء کو اپنا اپنا سامان خچروں پر لادا یا کندھوں سے لٹکایا اور نامعلوم منزل کی طرف کوچ کر دیا۔ اس طرح تاریخِ عالم کی عظیم ترین فوجی مہم یا لانگ مارچ کا آغاز ہوا۔ چیانگ کیشک کی فوجوں نے آگے بڑھ کر کیانگ سی سوویت پر جس کا ذکر کمیونسٹ فخر سے کیا کرتے تھے قبضہ کرلیا اور پھر سرخ فوج کے تعاقب میں روانہ ہوگئیں۔ چھ ہزار کمیونسٹ سپاہی اپنی بڑی فوج کو بچانے کے لیے پلٹ پڑے، اور دشمن کی مسلسل پیش قدمی کو روکنے کے لیے پروانہ وار جانوں پر کھیل گئے۔ وہ اس شجاعت سے جم کر لڑے کہ دشمن انگشت بدنداں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ لڑائی ختم ہوئی تو چھ ہزار جانثاروں کے لاشوں سے میدانِ جنگ پٹا پڑا تھا۔ ان کے سینوں سے ابلتے ہوئے دھاروں سے چاروں طرف لہو کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ ان کی سرفروشی اور قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ اس لڑائی کے دوران میں بڑی فوج دشمن کے نرغے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس بھاگ دوڑ میں کمیونسٹوں کے بیس ہزار زخمی اور بیمار سپاہی دیہاتیوں کے حوالے کیے گئے۔ چیانگ کے سپاہیوں نے انہیں چن چن کر قتل کر دیا۔ ان مقتولین میں ماؤزے تنگ کا بھائی ماؤٹسے تان بھی شامل تھا۔ دس لاکھ کمیونسٹ جو افراتفری کے عالم میں لانگ مارچ میں شریک نہ ہو سکے تھے، تہ تیغ کر دیئے گئے۔ چیانگ کیشک اور اہلِ مغرب نے خوشی کے شادیانے بجائے کہ چین میں اشتمالیت کا قلع قمع کر دیا گیا ہے جس سے ایشیاء سرخ خطرے سے محفوظ ہوگیا ہے لیکن وہ بھول گئے کہ:

> ”سب سے اچھی ہنسی اس کی ہوتی ہے جو سب سے آخر میں ہنستا ہے۔“

سرخ فوج نے ایک سال میں چھ ہزار میل کی مسافت طے کی۔ لانگ مارچ کے دوران میں سپاہیوں کو ہلاکت آفریں شدائد اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ فرسٹ آرمی کو

پندرہ بڑی بڑی جنگیں لڑنی پڑیں۔ دشمن سے جھڑپیں تو روزمرہ کا معمول بن گئی تھیں۔ جنرل ہولنگ کی فوج ستائیس دن لگاتار دن رات مارچ کرتی رہی۔ ایک دفعہ سپاہیوں کو ایک دن میں پچاس میل کا فاصلہ طے کرنا پڑا اور اوسطاً ایک دن میں سترہ میل چلنا پڑا۔ دریائے ہسیانگ کو عبور کرتے وقت کومن تنگ کی فوجوں نے انہیں آن لیا اور گھمسان کا رن پڑا۔ جس میں سرخ فوج کی کم وبیش آدھی نفری کھیت رہی۔ اکثر سپاہی پیدل چلتے رہے۔ افسروں کے لیے گھوڑے تھے لیکن انہیں زخمیوں اور بیماروں کے حوالے کر دیا گیا۔ مارچ کے دوران میں چیانگ کیشک کی فوجیں سرگرمی سے ان کا تعاقب کرتی رہیں اور آسمان سے ہوائی جہاز آگ برساتے رہے۔ سرخ سپاہیوں کو سطح زمین سے سولہ ہزار فٹ بلند پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر سے گزرنا پڑا۔ سینکڑوں سپاہی جن کی وردیاں پھٹ چکی تھیں' جاڑے کی ٹھر سے اکڑ کر مر گئے۔ کئی بار انہیں کہر کے اندھیاروں میں سے گزرنا پڑا اور وہ اولوں کی بارش میں آگے بڑھتے رہے۔ ہوا اتنی لطیف تھی کہ تھکے ماندے سپاہیوں کے لیے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ سپاہیوں اور مواشی کی کثیر تعداد کھڈوں میں گر گر کر فنا ہو گئی۔ 1935ء میں سرخ فوج سات دن تک دلدلوں سے پٹے ہوئے میدان سے گزرتی رہی۔ بھوکے پیاسے سپاہیوں نے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے بناسپتی کھانا شروع کی' ان میں کئی جڑی بوٹیاں زہریلی تھیں جنہیں کھا کر وہ بے ہوش ہو ہو کر گرے اور پھر نہ اٹھ سکے۔ بعض سپاہی مردہ گھوڑوں کا گوشت کھانے پر مجبور ہو گئے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ فاقہ زدہ سپاہی دیہات سے گذرے' جہاں درخت پھلوں سے لدے کھڑے تھے۔ کسان انہیں دیکھ کر سہم جاتے لیکن وہ کسی پھل کو چھوئے بغیر آگے بڑھ جاتے۔ جب کبھی انہیں راستے میں رسد خریدنے کا موقع ملا وہ کسانوں کو نقد قیمت ادا کرتے تھے۔ ان کے اس بلند کردار کو دیکھ کر کسان ہکا بکا ہو کر رہ گئے۔

سرخ فوج کے لیے دریائے تاتو کو عبور کرنا اس خطرناک مہم کا سب سے کٹھن مرحلہ تھا۔ کمیونسٹ سپاہیوں نے بھاگم بھاگ 63 میل کا فاصلہ 24 گھنٹوں میں طے کیا اور لوتنگ کے پل پر جا پہنچے۔ چیانگ کیشک کا خیال تھا کہ وہ سرخ فوج کو اس پنجرے میں پھانس کر اس کی گردن مروڑ دیں گے۔ پل کے دوسری جانب دشمن نے آگ لگا دی تاکہ پل جل کر گر جائے اور عبور محال ہو جائے۔ سرخ فوج کے بائیس (22) سپاہی مردانہ وار

بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس گئے اور گولیوں کی بوچھاڑ میں پل پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں ان نوجوانوں کو لانگ مارچ کے سب سے بڑے ہیرو قرار دیا گیا۔ لانگ مارچ کے خاتمے پر ایک امریکی صحافی ایڈگر سنو سے باتیں کرتے ہوئے ایک جواں مرد ہسیا تنگ چنگ نے کہا:

"کم و بیش دو سال مجھے کپڑے بدلنے کا موقع نہیں ملا اور میں راتوں کو جوتوں سمیت سوتا رہا۔ میرے اکثر ساتھیوں کی یہی حالت تھی۔ ان ایام میں ایک ہی وردی پہنے رہا جس کے چیتھڑے اڑ گئے اور جس پر بار بار پیوند لگانا پڑے ہمیں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ قطعی طور پر منقطع ہو گیا۔ ہماری حالت ان جنگلیوں جیسی تھی جو محض جلتا زندہ رہتے ہیں اور لڑتے ہیں۔ ہمارے بہترین افسر جنگوں میں مارے گئے یا بیمار پڑ گئے اور مر گئے۔ بعض اوقات ہمیں اجاڑ جنگلوں میں گھسنا پڑتا تھا۔ فاقے کاٹنے کی تو ہمیں عادت ہی پڑ گئی تھی۔ دشمن ہمیں نرغے میں لینے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے ہمیں بھوکا مارنے کے لیے دیہات اجاڑ دیئے' آگ لگا دی اور غلے کے کھتے اور کوٹھیار لوٹ لیے"۔[1]

اکتوبر 1934ء میں ایک لاکھ کمیونسٹ سپاہی لانگ مارچ پر روانہ ہوئے تھے ان میں سے صرف پانچ ہزار زندہ سلامت شمالی چین کے صوبے لی نان تک پہنچ سکے۔ 98 ہزار سفر کی کٹھن راہوں میں لقمۂ اجل بن گئے۔ بچی کھچی فوج کا ہر سپاہی شجاعت کا پیکر تھا۔ وہ جفاکشی' نبرد آزمائی' خطر پسندی کی بھٹی سے کندن بن کر نکلا تھا۔ لانگ مارچ کے روح پرور کارنامے سامراجی اور سرمایہ دارانہ جور و جفا کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کے دلوں میں سدا عزم و حوصلہ کی روح پھونکتے رہیں گے۔ لانگ مارچ فکری و عملی فیضان کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ بن گئی ہے اور اسے انقلابی جدوجہد کی ایک درخشاں علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شرکت کرنے والے سرفروشوں کی یادیں نہایت ولولہ انگیز ہیں۔ یہاں ہم ایک واقعہ درج کرنے پر اکتفا کریں گے۔ جسے ڈک ولسن نے اپنی کتاب لانگ مارچ میں درج کیا ہے۔

---

1. The Long March

ماؤزے تنگ کے بیٹ مین نے لانگ مارچ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جو دریائے تاتو کو عبور کرنے کے بعد پیش آیا تھا۔ کہتا ہے:

''حسب معمول ہم تڑکے روانہ ہوئے۔ چیئرمین ماؤزے تنگ کسی کام کو رک گئے اور سنٹرل کمیٹی سٹاف کی معیت میں جانے کی بجائے میڈکل کور میں شامل ہو کر آگے بڑھے۔ حفاظتی دستے کا سکواڈ لیڈر اور میں ان کے ساتھ تھے۔ ہم ایک کھلی وادی میں سے گذر رہے تھے جو میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک دشمن کے تین ہوائی جہاز نمودار ہوئے اور انہوں نے غوطے لگا کر ہم پر بم برسائے جو ہمارے قریب ہی گر کر پھٹے۔ ہم چیئرمین ماؤزے تنگ کو بچانے کے لیے لپکے۔ چیئرمین فی الفور اٹھ کھڑے ہوئے اور سکواڈ لیڈر پر جھک گئے۔ جس نے زخم کھایا تھا۔ سکواڈ لیڈر اپنے شانے کو تھامے بے حس وحرکت پڑا تھا۔ چیئرمین نے نرمی سے اس کا کندھا چھوا اور میڈکل افسر سے کہا:

''کیا تم اس کے لیے کچھ کر سکو گے؟''

سکواڈ لیڈر نے طبی امداد لینے سے انکار کر دیا اور کہا:

''نہیں نہیں! آپ آگے بڑھ جائیں''۔

اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کے بدن کا سارا لہو نچڑ گیا ہے۔ چیئرمین اس کے پاس بیٹھ گئے اور اس کا سر اٹھا کر کہا:

''کامریڈ ہو چنگ پاؤ! تم اچھے ہو جاؤ گے۔ بس چپکے لیٹے رہو' ہم تمہیں اٹھا کر شوٹ سین لے جائیں گے۔ جہاں ڈاکٹر تمہارا علاج کرے گا''۔

میرے سکواڈ لیڈر نے اپنے سر کو جو چیئرمین نے تھام رکھا تھا ہلاتے ہوئے کہا:

''میں نہیں چاہتا کہ آپ مجھے اٹھائے اٹھائے لیے پھریں۔ آپ زحمت نہ کریں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے لہو میرے اندر گر رہا ہے۔ آپ

میرے بارے میں چِنتا نہ کریں۔ میں اپنے حال پر راضی ہوں۔ ہاں میرے ماں باپ کو جو کیان کیانگسی میں رہتے ہیں' خبر کر دیجئے گا۔ مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ میں آپ کی ہمراہی میں شنسی نہیں جا سکا اور اپنے پڑاؤ کو دیکھ نہیں سکا"۔

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ پھر بڑی مشکل سے سانس لیا اور میری جانب دیکھ کر بولا:

"چنگ چانگ فنگ! چیئرمین ماؤزے تنگ اور دوسرے لیڈروں کا خیال رکھنا"۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی اور ہم سن نہ سکے کہ وہ کیا بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے پھر بولنے کی کوشش کی۔ ہم نے اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھے۔ اچانک بڑی کوشش سے باآواز بلند پکار کر کہا:

"انقلاب کی جے"۔

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

"سکواڈ لیڈر! سکواڈ لیڈر!" میں چلایا۔ وہ مر چکا تھا۔

چیئرمین نے اپنا بازو اس کی بغل سے نکالا اور کھڑے ہو کر مجھ سے کہا:

"لاؤ ایک رضائی"۔

میں نے بستر بند میں سے رضائی نکال کر انہیں دی۔ چیئرمین نے نعش کو اس سے ڈھانپ دیا۔"

بعد میں جاپانی حملہ آوروں کے خلاف لڑتے ہوئے جب کبھی لانگ کا کوئی ہیرو گولی کھا کر گرتا تھا تو وہ اپنی لانگ مارچ والی سرخ ٹوپی اپنے کسی ساتھی کو دے کر مرنے سے پہلے کہتا "اس ٹوپی کی لاج رکھنا" اس عظیم کارنامے کی روح رواں اور سرخ فوج کے نفس ناطقہ چیئرمین ماؤزے تنگ کو لانگ مارچ کے دوران جو عظمت حاصل ہوئی وہ تاریخ عالم کے صفحات پر نقش دوام بن کر ثبت ہو چکی ہے۔

1946ء میں جاپانیوں کی شکست کے بعد چین میں دوبارہ خانہ جنگی چھڑ گئی جس

میں کومن تنگ کو شکست فاش ہوئی اور چیئرمین ماؤزے تنگ نے یکم اکتوبر 1949ء کو اشتراکی انقلاب کی کامیابی کا اعلان کیا۔ چیئرمین کی رہنمائی میں چینی کمیونسٹوں نے اپنی معاشی اور سماجی مشکلات پر قابو پالیا اور دن رات محنت کر کے چین کو ایک عظیم صنعتی ملک بنا دیا۔ 1965ء کے اواخر میں بعض تمثیل نگاروں کی تحریروں کے بارے میں ایک طویل مباحثہ شروع ہوا جو کلچرل انقلاب کا عنوان بن گیا۔ بورژوا ذہنیت کے کچھ ادیبوں نے عوام کے ذہن کو ادب کے نام پر پراگندہ کرنے کی کوشش کی لیکن چیئرمین کی زیر ہدایت انہیں بے نقاب کیا گیا اور عوام نئے سرے سے انقلابی جذبے سے سرشار ہو گئے۔ ماؤزے تنگ 35 برسوں تک اپنی دانش و خرد سے جو اسے میدانِ عمل میں نامساعد حالات کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے حاصل ہوئی تھی' اپنے عوام کی رہبری کا فرض انجام دیتا رہا اور جب اس کا وقت سفر آن پہنچا تو کروڑوں چینی مردوں' عورتوں اور بچوں کے علاوہ دنیا بھر کے انقلاب پسندوں نے اس کے جسد فانی پر اپنی بے پناہ محبت اور عقیدت کے آنسو نچھاور کیے۔ زندگی میں اتنی محبت اور موت کے بعد اتنی عظمت تاریخ عالم میں چندگنی چنی ہستیوں کو نصیب ہو سکی ہے۔ آج بھی چینی عوام اور افریقہ' ایشیاء اور جنوبی امریکہ کے محنت کش اپنے محسن کے اقوال کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں اور ان سے ذوقی اور عملی فیضان حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہم چند ایک درج کریں گے:

☆...... ''رجعت پسند ہر کہیں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ رجعت پسندی کو ختم کرنے کے لیے اس پر کاری ضرب لگانا ضروری ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے فرش پر جھاڑو دی جائے۔ قاعدے کی بات ہے کہ جہاں کہیں جھاڑو نہیں پہنچے گا۔ وہاں کوڑے کرکٹ کی صفائی نہیں ہو سکے گی''۔

☆...... ''اشتراکی نظام معاشرہ سرمایہ داری نظامِ معاشرہ کی جگہ لے کر رہے گا۔ یہ ایک معروضی قانون ہے جو انسانی ارادے سے بالاتر ہیں''۔

☆...... جنگ سیاسیات کو جاری رکھنے کا نام ہے اور سیاسیات ایسی جنگ ہے جس میں خون نہیں بہایا جاتا''۔

☆...... ''تمام رجعت پسند کاغذی شیر ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں خوفناک لیکن اصل میں بودے۔ طاقت عوام ہی کے پاس ہے''۔

☆...... ہمیں سدا عوام کی خدمت پر کمر بستہ رہنا چاہیے اور خود نمائی اور تکبر کے بجائے بے نفسی اور دور اندیشی سے کام لینا چاہیے"۔

☆...... "عوام ہی تاریخ بناتے ہیں"۔

☆...... "جہاں کہیں جدوجہد ہوگی' وہاں قربانی دینا ہوگی۔ موت روزمرہ کا معمول ہے۔ ہمیں عوام کا مفاد عزیز ہے۔ اس لیے ہم عوام کی خاطر لڑتے ہوئے مریں گے تو اچھی موت مریں گے"۔

☆...... "ایک اچھے اشتراکی نظام میں عورتوں کی شمولیت لازمی ہے"۔

☆...... "مارکسیت کو کتابوں سے نہیں طبقاتی جدوجہد سے' عملی کام کر کے' عوام سے قریبی رابطہ قائم کر کے سیکھا جا سکتا ہے"۔

اشتراکی معاشرہ

نیا معاشی نظام

سوشلزم وہ نظام معاشرہ ہے جس میں وسائل پیداوار پر عوام کا قبضہ ہوتا ہے۔ پیداوار کی تقسیم منصفانہ ہوتی ہے اور ہر شخص کو اپنی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ سوشلزم سے بحث کرتے ہوئے برٹرنڈ رسل لکھتا ہے:

> ''سوشلزم کی ترکیب سب سے پہلے 1827ء میں استعمال کی گئی۔ رابرٹ اوون اور اس کے پیروؤں کو سوشلسٹ کہتے تھے۔ اس سے پہلے 1817ء میں ریکارڈو نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ کسی جنس کی قدر مبادلہ اس محنت سے معین ہوتی ہے جو اس پر صرف کی جاتی ہے۔ ٹامس ہاج سکن[1] نے اپنی کتاب میں کہا کہ جاگیردار اور صنعت کار مزدوروں کی محنت سے ناجائز منافع کما رہے ہیں۔ رابرٹ اوون نے دونوں کی تائید کی۔ جے ایس مل نے ان کے خلاف لکھا کہ یہ لوگ شخصی املاک کا خاتمہ کر کے نوع انسانی پر وہ مصائب لانا چاہتے ہیں جو تاتار اور ہُن بھی نہیں لائے تھے۔''[2]

ہم گذشتہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح کارل مارکس اور فریڈرک انجلز نے اپنے پیشروؤں کے اٹوپیائی تصورات کو حقیقت کا جامہ پہنایا اور شخصی املاک کے انسداد کے بعد ایک نیا معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دی جس میں وسائل پیداوار پر قبضہ کر کے

---

1. Labour Defended Against Claims of Capitalism
2. A History of Western Philosophy

محنت کش جبر و استحصال کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ کارل مارکس نے لکھا:

> ''ہمارا مقصد شخصی املاک کو ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں منتقل کرنا نہیں ہے بلکہ اسے مٹا دینا ہے۔ طبقاتی جدوجہد کو نرم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھنا ہے۔''

چین، روس، مشرقی یورپ کے ممالک وغیرہ میں انقلاب برپا کر کے اس معاشرے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں پیداوار محنت کشوں کی مشترکہ کوششوں سے حاصل ہوتی ہے لیکن اسے عوام پر منصفانہ تقسیم نہیں کیا جاتا۔ طفیل خوار صنعت کار اور سرمایہ دار اس پیداوار کو اپنی شخصی املاک سمجھتے ہیں اس لیے پیداوار کے اشتراکی کردار اور شخصی املاک میں تضاد رونما ہوتا ہے جسے اشتراکیت کے نفاذ ہی سے رفع کیا جا سکتا ہے۔ اشتراکی ممالک میں پیداوار اجتماعی صورت اختیار کر گئی ہے جس سے سرمایہ اور محنت تمول اور افلاس کے تضادات باقی نہیں رہے اور معاشرتی علائق پیداواری وسائل کی اجتماعی ملکیت سے صورت پذیر ہوئے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں پیداوار کا واحد مقصد ذاتی نفع کمانا ہے جب کہ اشتراکی معاشرہ میں:

1- منافع عوام پر تقسیم ہو جاتا ہے۔

2- صرف ذاتی استعمال کی اشیاء فراہم کی جاتی ہیں جس سے وسائل پیداوار پر شخصی تصرف کی نفی ہو جاتی ہے۔

3- پیداوار، تقسیم اور صرف باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہوتی ہے جس سے عوام کی اجتماعی بہبود میں اضافہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دار ممالک میں اس نوع کی اجتماعی منصوبہ بندی ممکن نہیں ہے کیونکہ ہر صنعت کار جائز و ناجائز طریقوں سے اپنی تجوری بھرنا چاہتا ہے۔ سرمایہ داروں کا نعرہ ہے ''ہر طریقے سے منافع کمانا'' اشتراکیوں کا نعرہ ہے:

> ''ہر حال میں پیداوار میں عوام کو شریک کرنا۔''

بورژوا زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے آئے دن اجناس کی قیمتیں بڑھاتے رہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے مصنوعی قلت اور ذخیرہ اندوزی کے ہتھکنڈوں

سے بھی کام لیتے ہیں۔ اشتراکی معاشرے میں ذاتی منفعت پیشِ نظر نہیں ہوتی اس لیے اجناس کی قیمتیں بحال رہتی ہیں اور مشترکہ تمول میں اضافہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دار وہی مصنوعات پیدا کرتے ہیں جن سے انہیں ذاتی فائدہ ہو۔ عوامی بہبود کا خیال انہیں پریشان نہیں کرتا۔ چنانچہ سرمایہ داری معاشرہ بحران کا شکار ہو جاتا ہے اور روز بروز افراطِ زر مہنگائی اور بے روزگاری میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بعض اوقات محنت کشوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ان کی اجرتیں بڑھا دی جاتی ہیں لیکن ساتھ ہی اجناس مہنگی کر کے یہ اضافہ واپس بٹور لیا جاتا ہے۔ حکومت کے مقاصد سیاسی ہوتے ہیں اس لیے اقتصادی تقاضوں کو سیاسی ضرورتوں پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ اشتراکی معاشرے میں:

1- پیداوار کے مسائل محنت کشوں کے اپنے قبضے میں ہیں۔
2- شخصی املاک کا خاتمہ کر کے اجتماعی اور مشترکہ املاک کی بناء پر معاشرے کو ازسرِ نو تعمیر کیا جا رہا ہے۔
3- شخصی املاک کے خاتمے کے ساتھ استحصال کا سدِ باب کر دیا گیا ہے' جس سے روائتی طبقاتی تفریق مٹ گئی ہے۔
4- صنعتی اور زرعی پیداوار کے لیے قومی پیمانے پر باقاعدہ منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ جس سے افرادِ معاشرہ قومی تمول میں شریک ہو جاتے ہیں۔
5- معاشرہ مالی بحران سے محفوظ ہے۔ افراطِ زر مہنگائی اور بے روزگاری کو ختم کر دیا گیا ہے۔
6- معاشی مساوات کے ساتھ حقیقی معاشرتی مساوات قائم کر دی گئی ہے۔
7- افرادِ معاشرہ کی جسمانی' ذہنی اور ذوقی ضروریات بوجہ احسن پوری کی جاتی ہیں۔ جس سے ان کی صلاحیتیں معاشرے کی بہبود کے لیے وقف ہو گئی ہیں۔

یاد رہے کہ اجتماعی املاک ہی اشتراکی معاشرے کا سنگِ بنیاد ہے اور جیسا کہ ہم آئندہ اوراق میں دیکھیں گے۔ اسی کے حوالے سے اشتراکی معاشرے کی اخلاقی' معاشرتی' ادبی و فنی قدروں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ یہاں ہم مختصراً اشتراکی روس کی علمی و صنعتی ترقی کا ذکر کریں گے کیونکہ جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح نظریہ اپنی عملی ترجمانی سے جانا جاتا ہے۔

زار پیٹر اعظم سے پہلے اہل مغرب روس کو اجڈ گنواروں کا ملک سمجھتے تھے۔ اس کا ذکر حقارت سے کرتے تھے۔ پیٹر اعظم نے پہلے پہل روس میں مغربی تہذیب و تمدن کی ترویج اور تحقیق و تکنیکی علوم کی اشاعت کا کام کیا۔ ملک قدرتی وسائل کی فراوانی کے باوجود صنعتی اور زرعی پہلو سے پسماندہ تھا۔ زرعی املاک پر جاگیرداروں کا قبضہ تھا جو کھیت غلاموں کی گاڑھے پسینے کی کمائی کو نہایت بے دردی سے عیش و عشرت میں اڑاتے تھے۔ کھیت غلاموں کی حالتِ زار و زبوں تھی۔ انہیں کھیتوں کے ساتھ ہی بیچ کر دیا جاتا تھا۔ 1905ء میں جاپان سے روس نے شکست کھائی تو زار شاہی ششدر رہ گئی لیکن وقت گذر چکا تھا۔ امریکہ اور یورپ کو صنعت و حرفت کے میدان میں کم و بیش دو سو سالوں کی سبقت حاصل تھی۔ کچھ انقلاب پسندوں نے زرعی غلامی کا خاتمہ کرنے کے لیے دسمبر 1825ء میں...... انہیں دسمبری کہا جاتا ہے...... تحریک چلائی تھی لیکن انہیں سختی سے کچل دیا گیا۔ سینکڑوں قتل کر دیئے گئے اور ہزاروں کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ روس کے قومی وقار کو دوسرا بڑا دھچکا اس وقت لگا جب پہلی عالمگیر جنگ میں مارشل ہنڈن برگ نے ٹینن برگ کی خونریز جنگ میں روسی فوجوں کو گھیر کر تباہ و برباد کر دیا۔ اس شکست کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ملک میں فولاد کی ترقی یافتہ صنعت موجود نہیں تھی جس کے باعث روسی فوج کو بھاری اسلحہ سے لیس نہ کیا جا سکا۔ اس دورِ آشوب میں لینن اور اس کے انقلابیوں نے روس میں اشتراکی انقلاب برپا کیا اور باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے چند ہی سالوں میں ملک کی کایا پلٹ دی۔ اشتراکی روس کی معجز نما ترقی کی داستان نہایت سبق آموز اور فکر انگیز ہے۔ ہم اس کی چند جھلکیاں ہی دکھا سکیں گے۔

انقلاب کے فوراً بعد لینن نے اعلان کیا کہ ملک کے طول و عرض میں برقی نظام قائم کر دیا جائے گا۔ انگریز دانش ور ایچ جی ویلز اس موضوع پر لینن کی باتیں سن کر حیرت زدہ رہ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص مجھے پریوں کی کہانیاں سنا رہا ہے۔ اتنے وسیع ملک کو چند سالوں میں برقا دینا کیسے ممکن ہو سکتا ہے لیکن لینن کی انتھک کوششوں سے اس منصوبے کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی فولاد کی بھاری صنعت کی طرف توجہ دی گئی۔ جابجا بڑے بڑے کارخانے قائم کیے گئے اور محنت کشوں کے عزم و حوصلہ نے جملہ تکنیکی مشکلات پر قابو پا لیا۔ مزدور اور کسان جبر و استحصال کی زنجیروں سے آزاد ہو کر بے پناہ جذبۂ عمل

سے سرشار ہو گئے۔ ان کی شبانہ روز محنت رنگ لائی۔ انقلاب روس کے پہلے چالیس پچاس برسوں میں ملک کی صنعتی پیداوار 66 گنا ہو گئی۔ دھات کی صنعت 538 گنا بڑھ گئی۔ کیمیائی صنعت میں 294 گنا اضافہ ہوا' فولاد کی صنعت 2205 گنا' بجلی کی پیدوار 217 گنا' سیمنٹ 45 گنا' نقل و حمل کے وسائل 2301 گنا بڑھ گئے۔ آج روس کئی صنعتوں میں اضلاع متحدہ امریکہ کے ہم دوش ہو گیا ہے اور بعض صنعتوں میں اس کا ہم پلہ ہوا چاہتا ہے۔ روس نے اضلاع متحدہ کی ایٹمی اجارہ داری کا خاتمہ کیا' پہلا آدمی خلاء میں بھیجا۔ وہ ایٹمی اسلحہ' بین البراعظمی میزائلوں' مصنوعی سیاروں اور ایٹمی آبدوزوں میں امریکہ کے برابر ہے یا اس سے آگے ہے۔ 1940ء میں روس نے ایک کروڑ تراسی لاکھ ٹن فولاد پیدا کیا' تین کروڑ گیارہ لاکھ ٹن مٹی کا تیل نکالا' 57 لاکھ ٹن سیمنٹ بنایا۔ ایک لاکھ چون ہزار موٹر کاریں بنائیں۔ اکتیس ہزار چھ سو ٹریکٹر بنائے۔ 1945ء میں بے پناہ جنگی نقصان کے باوجود 1940ء سے پانچ گنا زیادہ فولاد' آٹھ گنا زیادہ تیل' 13 گنا زیادہ سیمنٹ' 402 گنا زیادہ کاریں' 11 گنا زیادہ ٹریکٹر' 10.5 گنا زیادہ برقی توانائی پیدا کی گئی۔ بجلی کی پیداوار میں روس تمام ملکوں سے آگے ہے۔ براٹسک ہائیڈرو الیکٹرک سٹیشن اپنی قسم کا عظیم ترین مرکز ہے۔ صرف سائبریا میں 38 لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ دولگا ہائیڈرو الیکٹرک سٹیشن 23 لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کرتا ہے جبکہ امریکہ کا گرانڈ کولی سٹیشن بیس لاکھ کلوواٹ کے لگ بھگ بجلی پیدا کرتا ہے۔

سوویت روس میں ہر سال گیارہ لاکھ لوگوں کو نئے تعمیر کیے ہوئے مکان مہیا کیے جاتے ہیں۔ دنیا بھر کی صنعتی پیداوار میں آج کل اشتراکی ممالک کا حصہ 38 فیصد ہے جب کہ تنہا روس کا حصہ بیس فیصد ہے جس میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔

سائبیریا کے یخ بستہ برف زاروں اور کرغیزیا کے اتھاہ ویرانوں میں بھاری صنعتوں کے سینکڑوں کارخانے قائم کیے گئے ہیں۔ روس میں زراعت کو بھی صنعت بنا دیا گیا ہے اور کاشتکاری کا کام کلوں سے لیا جا رہا ہے۔ اجتماعی کھیت جدید شہروں کی صورت اختیار کر گئے ہیں جو ہر قسم کی آسائشوں کے مرکز بن گئے ہیں۔ قوم کا بچہ بچہ زیور تعلیم سے آراستہ ہے۔ ترکمانیہ' کرغیزیا' ازبکستان' قفقاز جیسے علاقوں میں جہاں انقلاب سے پہلے لوگ جاہل مطلق تھے اب سینکڑوں اعلیٰ درس گاہیں اور ادارے کھل گئے ہیں اور کل بھیڑ

بکریوں کو چرانے والے گڈریئے آج سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ زار کے عہد میں سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کی تعداد ایک کروڑ اٹھاون لاکھ تھی۔ 66-1965ء میں یہ تعداد بڑھ کر سات کروڑ چون لاکھ ہو گئی۔ 1968ء میں روسی سائنسدانوں کی تعداد دنیا بھر کے سائنسدانوں کی ایک چوتھائی تھی۔ جب روس نے پہلا آدمی خلا میں بھیجا تو روس کی تکنیکی مہارت پر امریکی سکتے میں آ گئے اور انہوں نے اپنی درسگاہوں میں اعلیٰ ریاضیات' طبعیات اور کیمسٹری کے نصاب کو از سرِ نو مرتب کیا۔

سوویت روس کی یہ حیرت انگیز ترقی اشتراکی انقلاب ہی کا ثمرہ ہے اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ نظریاتی [1] تحریک وتشویق شخصی منافع خوری سے کہیں زیادہ قوی اور مؤثر ہوتی ہے۔ ذاتی منافع خوری نے صنعتی ترقی کا جو کام دو سو برس سے زیادہ میں انجام دیا تھا وہی کام نظریاتی تحریک نے پچاس برسوں میں کر دکھایا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اشتراکی معاشرے کو مریضانہ زر پرستی' طبقاتی تفریق اور جابرانہ استحصال سے جو بورژوا معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہے ہیں' پاک کر دیا گیا ہے۔ ہم اس نئے معاشرے کی نئی قدروں کے بارے میں بات کریں گے۔

اخلاق کے نئے معیار:

انسان اخلاق کا مکلف اس لیے ہوا کہ ایک تو وہ ذی عقل ہے اور دوسرے وہ معاشرے کا فرد ہے۔ کسی حیوان کو اس بات کی فکر لاحق نہیں ہوتی کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے' مجھے ایسا کرنا چاہیے' میرا یہ فعل درست ہے یا نادرست ہے' جائز ہے یا ناجائز ہے' مناسب ہے یا نامناسب ہے۔ انسان ذی عقل ہونے کے باعث اپنے طرزِ عمل کے اچھے یا بُرے ہونے کے دلائل بھی تلاش کرتا ہے اور یہی اخلاقیات کا نقطۂ آغاز ہے۔ فلسفے کی ابتداء سے اخلاقیات کے دو نظریئے کسی نہ کسی صورت میں موجود رہے ہیں۔

(1) وجدانیت [2] (2) فطرت پسندی [3]

1- وجدان پسند کہتے ہیں کہ اخلاقی قدریں ازلی ہیں اور انسان کی سرشت میں موجود ہیں۔ بچہ ماں کے پیٹ سے نیک و بد کی تمیز لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بطون

---

[1] Ideological Motivation [2] Intuitionism

[3] Naturalism

میں ایک پراسرار آواز یعنی ضمیر اسے نیکی پر تحسین اور بدی پر ملامت کرتی رہتی ہے۔

2- فطرت پسندوں کے خیال میں بچہ ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے ماحول سے متاثر ہو کر نیک و بد کی تمیز سے واقف ہوتا ہے اور اپنے والدین کی مثال کے پیش نظر برائی اور اچھائی کے معیار مقرر کرتا ہے۔ وہ ازلی اور وہبی اخلاقی قدروں کے قائل نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ اخلاقی قدریں اضافی ہوتی ہیں اور ماحول کے بدلنے کے ساتھ بدل جاتی ہیں۔ ضمیر ہولباخ کی زبان میں پولیس کا خوف ہے اور کوئی پراسرار آواز نہیں ہے۔

یاد رہے کہ وجدان پسند شروع سے مذہب اور مثالیت کی طرف مائل رہے ہیں جب کہ فطرت پسندوں کا رخ مادیت اور سائنس کی جانب رہا ہے۔

اخلاقی قدروں کا تعین کسی نہ کسی مقصد یا معیار کے حوالے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ رواقیین اور کانٹ کے یہاں فرض برائے فرض اخلاقی عمل کا معیار ہے۔ جیریمی بنتھم' جان سٹوارٹ مل اور سجوک کہتے ہیں کہ افادیت اور حظ و مسرت کا حصول انسانی زندگی کا مقصد اولین ہے اس لیے وہ اس کے حصول کی کوشش میں بااخلاق زندگی گذار سکتا ہے۔ ولیم جیمز اور ڈیوی کے خیال میں ہم اسی عمل کو اخلاقی کہیں گے۔ جس سے ہمیں ٹھوس فائدہ پہنچ سکے۔ تاریخ اخلاقیات کے مطالعے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ روائتی اخلاق کے دو پہلو ہیں:

1- فردیت یعنی کسی فرد کی ذاتی مسرت' ذاتی مفاد اور ذاتی لذت ہی حسنِ اخلاق کا معیار ہے۔

2- ماورائیت یعنی بعض ایسی ہستیاں انسان کے لیے اخلاقی اصول وضع کرتی ہیں جو اس کے عمرانی اور معاشی ماحول سے ماورا ہیں۔

زرعی معاشرے کی اخلاقی قدریں شخصی املاک کے حوالے سے صورت پذیر ہوئی تھیں یعنی جو عمل شخصی املاک کا تحفظ کرتا ہے وہ خیر ہے اور جو اس کی تخریب کا باعث ہوتا ہے وہ شر ہے۔ اس معیار کو تقدس کا درجہ دینے کے لیے آسمان کا سہارا لیا گیا۔ حمورابی شاہ بابل کا دعویٰ تھا کہ اسے خداوند خدا بعل مردوخ نے ضابطہ قوانین عطا کیا تھا جس میں شخصی املاک کا تحفظ مقصود تھا۔ اس میں چوری' ڈاکہ' بدکاری اور بغاوت کی سزا موت ہے کیونکہ

ان سے شخصی املاک معرض خطر میں پڑ جاتی ہے۔ مؤرخین کے خیال میں یہودیوں کے احکام عشرہ بھی اسی ضابطے سے ماخوذ ہیں کہ ان میں بھی شخصی املاک ہی کو تحفظ دیا گیا ہے۔

جدید سائنس کے فروغ اور صنعتی انقلاب کے نفوذ کے ساتھ زرعی معاشرہ متزلزل ہوگیا۔ ایک طرف سرمایہ داروں نے جاگیرداروں کی طرح شخصی املاک کا تقدس بحال رکھنے پر کمر باندھی اور دوسری طرف اشتراکیوں نے شخصی املاک کو ظلم وستم اور جبر و استحصال کی جڑ قرار دیا اور اس کے انسداد کے لیے مہم شروع کی۔ اشتراکی خیالات کی اشاعت کے ساتھ وہ اخلاقی قدریں جو زرعی معاشرے اور شخصی املاک کے ساتھ وابستہ تھیں بدلتی جا رہی ہیں اور نئی نئی اخلاقی قدریں اجتماعی املاک کے حوالے سے صورت پذیر ہو رہی ہیں۔ روایتی اخلاقیات میں مقتدر طبقے کے استحصال اور شخصی املاک کے حق کو تسلیم کر لیا گیا تھا گویا اخلاقی اصول خواہ کتنے ہی اعلیٰ وارفع وضع کیے جائیں۔ محنت کش طبقہ بہر صورت اپنے حقوق انسانی سے محروم رہے گا۔ ہسپانوی اکھاڑے کا سانڈ خواہ کچھ بھی کرتا رہے مرنا آخر اسی کو ہے' البتہ روایتی اخلاق میں اس سانڈ کو چند واضح قواعد ہی کے تحت مارا جا سکتا ہے۔ یہ کبھی نہیں سوچا جاتا کہ سانڈ کو جان سے مار دینا اخلاقی پہلو سے عیب بھی ہو سکتا ہے۔ اہل فکر جان گئے ہیں کہ سائنس کی ترقی اور صنعتی معاشرے کے قیام کے ساتھ پرانی اخلاقی قدریں بدلتی جا رہی ہیں۔ جیسا کہ جے جی فریزر کہتا ہے:[1]

> ''ہم پسند کریں یا نہ کریں اخلاقی ضابطہ جو ہمارے اعمال پر کارفرما ہے مستقلاً بدلتا رہتا ہے۔ اس میں ترمیم کا عمل برابر جاری ہے اور ایک غیر مرئی ہاتھ نئے نئے قواعد تالیف کر رہا ہے۔ ردّ و بدل کا یہ کام ایسے نہیں ہو رہا جیسا کہ کسی قانونی ضابطے میں رسمی اور ظاہری ترمیم سے ہوتا ہے بلکہ اخلاقی قواعد نامحسوس اور غیر رسمی انداز میں بدلتے جا رہے ہیں۔''

اس میں شک نہیں کہ اقتصادی' سیاسی اور سماجی انقلاب کے ساتھ اخلاقی انقلاب بھی برپا ہو رہا ہے اور یہ تبدیلیاں اشتراکیت کے رواج و قبول کے ساتھ واقع ہو رہی ہیں۔ اشتراکی معاشرے کی نئی اخلاقی قدروں کا جائزہ لینے سے پہلے اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بورژوا طبقہ روایتی اخلاق کو جو جبر و استحصال پر مبنی تھا باقی و بحال رکھنے میں کوشاں

---

1. Man, God and Immortality

ہے۔ سرمایہ داروں کی اخلاقیات کا اصل اصول یہ ہے کہ صرف ذاتی مفاد ہی اخلاقی عمل کا اولین محرک ثابت ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ لوگ زبان سے ازلی و ابدی اخلاقی قدروں کا ذکر ضرور کیے جاتے ہیں اور ان کے نام پر کوریا' ویت نام' الجیریا' فلسطین' چلی' نامیبیا اور روڈیشیا وغیرہ کے حریت پسندوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ ازلی و ابدی اخلاقی قدروں کا یہ ماورائی تصور ریاست اور کلیسا کے قدیم اتحاد سے یادگار ہے۔ ہمارے دور کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو ورثے میں ملا ہے۔ اس عقیدے کی رو سے اخلاق اقتصادی احوال سے ماورا ہوتا ہے حالانکہ تاریخ عالم کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اقتصادی' عمرانی اور سیاسی تقاضوں کے بدلنے کے ساتھ اخلاقی قدریں بھی مختلف زمانوں میں بدل جاتی ہیں۔ شخصی املاک اور استحصال کا خواہ کچھ بھی جواز پیش کیا جائے۔ اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ ایسے معاشرے میں جس کے چند افراد نے اکثریت کو معاشی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہو خیر عدل یا مسرت کو اخلاقی مقصد نہیں بنایا جا سکتا۔

اشتراکی معاشرے کی قدریں شخصی املاک کی بجائے اجتماعی املاک سے اور استحصال کی بجائے امدادِ باہمی کے اصول پر مبنی ہیں کیونکہ اس میں طبقاتی تفریق کا خاتمہ کر کے حقیقی مساوات قائم کر دی گئی ہے جو مثالیاتی یا ماورائی نہیں ہے بلکہ معاشی برابری کی ٹھوس بنیاد پر قائم ہے۔ روایتی اخلاق اور اشتراکی اخلاق میں بھی یہی سب سے بڑا فرق ہے کہ اشتراکی معاشرے کی اخلاقی قدریں معاشی احوال سے جدا نہیں ہیں بلکہ انہی سے نکلی ہیں ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاشی احوال وجود بناتے ہیں جب کہ اخلاقیات' سیاسیات' جمالیات وغیرہ اسی وجود کے شعوری فروغ ہوتے ہیں لہٰذا اخلاقی قدریں معاشی احوال کے بدلنے کے ساتھ بدل جاتی ہیں۔ اس اصول کے مطابق جو نظام معاشرہ شخصی املاک پر مبنی ہوگا۔ اس کی اخلاقی قدریں لامحالہ حسد' لالچ' بغض' تصرف' تغلب' لوٹ کھسوٹ اور جبر و استحصال کے تخریبی جذبات سے متاثر ہوں گی۔ دوسری طرف اجتماعی املاک نظامِ معاشرہ کا اصل اصول بن جائے گی تو اس سے قدرتاً ایثار نفس' امدادِ باہمی' انسان دوستی اور مروت احسان کے تعمیری جذبات کو تقویت ہوگی کیونکہ اس معاشرے کے افراد ذاتی نفع خوری کے بجائے پورے معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں گے۔

قدر کی حقیقت یہ ہے کہ ہم جس شئے میں دلچسپی لیں اس میں ہمارے لیے قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ ماحول کے سماجی اور معاشی تقاضوں کے بدلنے کے ساتھ ہماری دل چسپیاں بدل جاتی ہیں اور دل چسپیوں کے بدلنے کے ساتھ قدریں بھی بدل جاتی ہیں۔ اخلاقی قدریں معاشرے کے معاشی اور سماجی تقاضوں اور فرد کی دلچسپیوں کی باہمی تاثیر و تاثر سے وجود میں آتی ہیں اور کسی بھی صورت میں ان تقاضوں سے ماورا نہیں ہوتیں۔

اخلاقیات کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اس کی قدریں کسی نہ کسی مقصد یا نصب العین سے وابستہ ہوتی ہیں۔ ظاہراً مقصد گھٹیا ہوگا تو متعلقہ قدریں بھی گھٹیا ہوں گی اور مقصد اعلیٰ و ارفع ہوگا تو اس سے مربوط قدریں بھی اعلیٰ و ارفع ہوں گی۔ سرمایہ داری معاشرے میں حصول املاک اور ہوسِ زر کا بھوت ہر شخص کے سر پر سوار رہتا ہے۔ اور یہی اس معاشرے کے افراد کی زندگی کا مقصد بھی ہے۔ اس گھٹیا مقصد سے اعلیٰ و ارفع اخلاقی قدریں کیسے وابستہ ہو سکتی ہیں۔ دوسری طرف اشتراکی معاشرے میں شخصی املاک نفع خوری اور استحصال کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور اس کے افراد اجتماعی مفاد کے لیے کام کر رہے ہیں جس سے انسان دوستی کے نصب العین کی عملی ترجمانی ممکن ہو گئی ہے اور اس سے متعلقہ قدریں بھی بلند تر ہو گئی ہیں۔

ارسطا طالیس نے بجا کہا تھا کہ اخلاقیات کو سیاسیات سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مارکس کی فکر میں سیاسیات کی طرح معاشیات کا بھی اخلاقیات کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اگر کوئی مسئلہ اخلاقی ہے تو وہ معاشی مسئلہ نہیں بن سکتا۔ مارکس اور انجلز کے خیال میں اخلاقیات معاشی اور عمرانی احوال کے ساتھ جدلیاتی طور پر مربوط ہے اور معاشرے کے اقتصادی احوال سے ہٹ کر اخلاقیات کا مطالعہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کے ہاں استحصال کا انسداد خیر ہے اور اس کا قیام شر ہے۔ وہی شخص بااخلاق کہلانے کا مستحق ہے جو اجتماعی مفاد کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور معاشی ناانصافی کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ اس جدوجہد سے ہٹ کر کسی شخص کی اخلاقی قدروں کی بات کرنا بے مصرف اور بے معنی ہوگا۔ اخلاق کی تعریف کسی فرد کے حوالے سے نہیں کی جا سکتی بلکہ اجتماعی مفاد ہی کو کسی فرد کے اخلاقی طرزِ عمل کے جانچنے کا معیار بنانا ضروری ہے۔ اشتراکیت کی یہ نئی اخلاقیات مثالی افراد کے حوالے سے مثالی معاشرے کی تلاش نہیں کرتی

بلکہ مثالی معاشرے کے حوالے سے مثالی افراد کی جستجو کرتی ہے۔ مارکسیوں کے خیال میں زبانی کلامی پند و نصیحت سے افراد معاشرہ کے اخلاق کو سنوارا نہیں جا سکتا۔ اس مقصد کے لیے انہیں معاشی آسودگی سے بہرہ ور کرنا شرط اول ہے جیسا کہ بنجمن ٹامسن نے بھی کہا تھا۔

> ''پہلے مفلسوں کے بھوکے پیٹ کی آگ بجھا کر انہیں خوش کرنا اور اس طرح انہیں نیک بننے کا موقع دینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ انہیں پند و نصیحت کی جائے اور پھر ان کی بھوک کو رفع کرنے کا سامان کیا جائے۔''

سرمایہ داری معاشرے میں محض پند و نصیحت سے کام لیا جا رہا ہے لیکن عوام کی غربت کو عملاً دور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اشتمالی معاشرے میں افراد کو معاشی آسودگی سے بہرہ ور کر دیا گیا ہے جس سے وہ خود بخود نیکی کی جانب مائل ہو گئے ہیں۔ مارکس کہتا ہے کہ محنت کش طبقے کو بامر مجبوری اپنی آزادی کی خاطر جدوجہد کرنا پڑتی ہے لہٰذا ایسی اخلاقیات کی ضرورت ہے جو محنت کشوں کی اخلاقیات کے ساتھ ساتھ ساری نوع انسان کے لیے قدریں تخلیق کرے کہ یہی جدید دور کی بلند ترین اخلاقی قدریں ہوں گی۔ اس کے بقول اشتراکی انقلاب کے ساتھ آدمی حقیقی اخلاقی معیار قائم کرنے کے قابل ہوا ہے۔ مارکس کی اخلاقیات کے اصل اصول مختصراً درج ذیل ہیں۔

1- اخلاقی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔
2- اخلاقی قدریں کسی معاشرے کے معاشی احوال اور معاشی علائق کے مطابق بدل جاتی ہیں۔
3- کسی عہد کی غالب اخلاقی قدریں اس کے غالب طبقے کی قدریں ہوتی ہیں۔

تیسری شق کی تشریح یہی کی جائے گی کہ آج کل کے بورژوا کا نظام اخلاق ان کے مفاد اور نفع خوری کی تقویت کا باعث ہو رہا ہے اور بورژوازی طرح طرح کے حیلے بہانوں سے اپنی لوٹ کھسوٹ بحال رکھنے میں کوشاں ہے۔ مثلاً ان کا ایک نعرہ ہے ''کاروبار آخر کاروبار ہی ہوتا ہے۔'' جس سے وہ اپنے جبر و استحصال کا جواز پیش کرتے ہیں۔ گویا طبقاتی معاشرے کا اخلاق بھی طبقاتی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اشتراکی معاشرے میں محنت کش خود مقتدر ہیں۔ اس لیے ان کا نظام اخلاق عمومی فلاح و بہبود کی ضمانت دیتا ہے۔

جدید اخلاقیات کی بحث میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اخلاقی قدریں طبقاتی کشمکش سے بالاتر ہوتی ہیں یا اس کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں۔ مارکس کے خیال میں محنت کش جملہ بنی نوع انسان کو استحصال سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ جس سے ایک ایسی نئی اخلاقیات صورت پذیر ہو رہی ہے جو بیک وقت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی کیونکہ عمومی فلاح کے ساتھ محنت کشوں کے اخلاق خود بخود سنور جاتے ہیں۔

بورژوا دانش ور طبقاتی تعصب کے باعث کارل مارکس کے افکار کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ یہ ان کا محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ اس ضمن میں مارکسیوں پر ایک الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز وسیلے کو اختیار کرنا ضروری سمجھتے ہیں لہٰذا اخلاق کے دشمن ہیں۔ آلڈس ہکسلے نے تو اس موضوع پر ایک پوری کتاب لکھی ہے جو کھوکھلے فلسفہ کی ایک اچھوتی مثال ہے۔ جان ڈیوس نے بھی اس بناء پر اشتراکیت کے خلاف قلم اٹھایا تھا کہ وسائل مقاصد کا جواز نہیں بن سکتے۔ چونکہ مارکسی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مسلح بغاوت کرتے ہیں لہٰذا وہ اخلاقی اصولوں کے منکر ہیں۔ بات یہ ہے کہ آلڈس ہکسلے' جان ڈیوی اور ان کے ہم نواؤں نے وسائل کو مقاصد سے جدا کر دیا ہے جس کے باعث وہ فکری مغالطوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس نزاع کا تجزیہ کرنے سے پہلے دو باتوں کا ذہن نشین کر لینا مناسب ہوگا۔

1- وسائل اور مقاصد ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے بلکہ باہدگر مربوط ہوتے ہیں۔

2- پہلے مقصد کا تعین کیا جاتا ہے پھر اس کے حصول کے لیے مناسب وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔

اس بات سے انکار کرنا مشکل ہوگا کہ مارکسیوں کا مقصد نہایت شریفانہ اور اعلیٰ ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ عالم میں پہلی بار عوام کو جبر و استحصال سے نجات دلانے پر کمر ہمت باندھی ہے اور معاشی مساوات کے قیام کو اپنی جدوجہد کا نصب العین قرار دیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مارکسی جو وسائل اختیار کرتے ہیں ان کا انحصار اشتراکیوں سے زیادہ سرمایہ داروں پر ہے۔ جب سامراجی اور سرمایہ دار اپنا جبر و استحصال بحال رکھنے کے لیے قتل و غارت سے کام لیتے ہیں تو اشتراکیوں کو بھی جواب میں ہتھیار

اٹھانا پڑتے ہیں۔ جو بات بورژوا کے لیے جائز ہے وہ پرولتاریہ کے لیے کیوں ناجائز ہوگئی۔ بورژوا طوع ورغبت سے جبر واستحصال سے باز آجائیں تو پرولتاریہ کو لڑائی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی اور نہ وسائل کے جواز یا عدم جواز کا سوال پیدا ہوگا۔ ابراہیم لنکن نے 1864ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

> "گڈریا بھیڑ کو بھیڑیئے کے پنجے سے چھڑاتا ہے۔ جس کے لیے بھیڑ اسے اپنا محسن سمجھتی ہے لیکن بھیڑیا گڈریے کو برا بھلا کہتا ہے اور اسے اپنی آزادی پر حملہ قرار دیتا ہے...... ہم روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ جب ہزاروں افراد کو غلامی سے آزاد کرایا جائے تو کچھ لوگ اسے آزادی کا نام دیتے ہیں (غلام) اور دوسرے (آقا) آزادی سلب کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔"

یہی بات آج ہم بورژوا کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ جب محنت کش عوام کو ان کے آہنی چنگل سے آزاد کرانے کی کوشش کی جائے تو وہ الزام لگاتے ہیں کہ ہماری آزادی پر حملہ کیا جا رہا ہے اور ہمیں آزادی عمل سے محروم کرنے کے لیے ناجائز وسائل اختیار کیے جا رہے ہیں۔ جب سامراجی کیوبا، چلی، ویت نام، کانگو وغیرہ کے دیسیوں کو اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے خاک وخون میں ملاتے ہیں تو وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کا تحفظ کر رہے ہوتے ہیں اور جب ان ممالک کے حریت پسند ہتھیار اٹھا کر ان کے مقابلے پر نکل کھڑے ہوتے ہیں تو وہ ناجائز وسائل اختیار کر کے اخلاقی قدروں کی جراحت کرتے ہیں۔ آخر منافقت کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سامراجی حالات کو جوں کا توں رکھنے کے لیے میکیاویلی کے ہتھکنڈے استعمال کریں تو حق بجانب ہیں اور ان ہتھکنڈوں کو ناکام بنانے کے لیے جدوجہد کی جائے تو یہ اخلاق کے منافی ہے چہ خوب! گویا استحصالی احوال کو جوں کا توں رکھنا خیر ہے اور اسے بدلنے کی کوشش کرنا شر ہے جو سامراجی لوٹ کھسوٹ کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا رویہ اخلاقی ہے اور جو ان کے ظلم وستم کی زنجیریں توڑنے کے لیے عملی اقدام کرتے ہیں وہ غیر اخلاقی وسائل سے کام لیتے ہیں اور اخلاق کے دشمن ہیں۔ نظر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سامراجیوں اور اجارہ داروں کے لیے وسائل و مقاصد کوئی اخلاقی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت بنتا ہے جب

محکوم و مظلوم طبقے کو اپنے انسانی حقوق کے لیے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ مارکسی وسائل اور مقاصد کو ایک دوسرے سے جدا نہیں مانتے۔ ان میں جدلیاتی اتحاد کے قائل ہیں اور انہیں ایک ہی عمل کے دو پہلو کہتے ہیں۔ اس لیے ان پر ناجائز وسائل اختیار کرنے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کے یہاں وسائل مقاصد میں بدل جاتے ہیں اور مقاصد از خود وسائل میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ الزام ان سامراجی اجارہ داروں پر لگانا قرین صحت ہوگا۔ جن کی زندگی کا واحد مقصد نفع خوری اور استحصال ہے اور جو اس کی خاطر ہر قسم کے جبر و ستم کے ساتھ نپام بم' ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے استعمال کو جائز سمجھتے ہیں۔ صدر ٹرومین نے ایٹم بموں سے لاکھوں جاپانیوں کو خاک و خون میں ملا کر نہایت ڈھٹائی سے کہا تھا کہ اس نے اپنے سپاہیوں کو موت سے بچانے کے لیے یہ اقدام کیا ہے جو ہر طرح سے اخلاقی ہے۔ حال ہی میں جب نیوٹران بم کے خلاف ساری دنیا میں احتجاج کی لہر دوڑ گئی تو امریکی سامراجیوں نے کہا کہ یہ بم عین اخلاقی ہے کیونکہ اس سے صرف جاندار ہلاک ہوں گے' املاک کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کی تہہ میں مجرمانہ بورژوا ذہنیت کارفرما ہے جو اینٹ پتھر کو انسانی زندگی سے برتر سمجھتی ہے۔

اقوام عالم صبح تاریخ سے اپنی آزادی کی خاطر مسلح جدوجہد کرتی رہی ہیں۔ خود امریکیوں نے انگریزوں کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکنے کے لیے ایک طویل خونریز جنگ لڑی تھی لیکن جب افریقہ' لاطینی امریکہ اور ایشیا والوں نے امریکہ کی سامراجی اور معاشی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہتھیار اٹھائے تو امریکی دانشوروں نے کہا کہ یہ شر پسند اخلاق سے عاری ہیں۔

جب مارکسیوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ حصول مقصد کے لیے ناجائز وسائل اختیار کرتے ہیں تو اس کا اصل مطلب یہ کہنا ہوتا ہے کہ مارکسیوں کی کوئی اخلاقیات ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسداد استحصال اور حقیقی مساوات کے قیام کے نصب العین کے باعث مارکسیوں کی اخلاقیات کی جڑیں انسان کے پورے تاریخی و سماجی عمل میں پیوست ہیں البتہ انہوں نے مقتدر استحصالی طبقے کی منافقانہ اخلاقیات کو ضرور رد کر دیا ہے۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ غریب کسانوں' مزدوروں اور انقلابی دانشوروں کا اخلاق سرمایہ داروں' تاجروں اور ساہوکاروں کے اخلاق سے بہ مدارج بلند تر ہوتا ہے اور وہ حقیقی

مساوات قائم کر کے معاشرہ انسانی کو اعلیٰ سطح پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کے اخلاقی مسائل ذاتی و ملکی حدود سے تجاوز کر کے ساری نوع انسانی پر محیط ہوتے جا رہے ہیں۔ نسلی منافرت' جنگ' افلاس' جہالت' انسانی حقوق' ضبط تولید ہر ذی شعور شخص کے اخلاقی مسائل بن گئے ہیں اس لیے انسان کے طرزِ عمل کو جانچنے کے لیے ایک ایسے نظریئے یا معیار کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے جو ان مسائل کی روشنی میں خیر اور شر کا ازسرِ نو تعین کرے اور نئے سرے سے حقیقی انسان دوستی کے بلند نصب العین کی نشان دہی کرے۔ اشتمالیوں نے عالمی سطح پر اس نصب العین کا تعین کیا ہے اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس لیے ان کی اخلاقیات زیادہ محکم بنیادوں پر قائم ہے اور ان کے اخلاق و اطوار بورژوازی کے اخلاق و اطوار سے بدرجہ اولےٰ بلند تر ہیں۔

نئی جمالیات:

کارل مارکس کے خیال میں پیداوار کے علائق سیاسی' سماجی اور اخلاقی اعمال کی طرح جمالیاتی عمل کو بھی معین کرتے ہیں۔ اس لیے صداقت اور خیر کی طرح حسن کی قدر بھی اضافی ہے۔ اس کا معروف نظریہ یہ ہے کہ معاشی بنیادوں کے بدل جانے سے ساری بالائی عمارت بھی بدل جاتی ہے۔ اس بالائی عمارت میں سیاسیات' اخلاقیات' سماجی شعور' کلچر' فنون لطیفہ اور ادبیات بھی شامل ہیں۔ فن و ادب میں یا معاشرتی اور اقتصادی احوال کا براہ راست عکس پڑتا ہے (فن تعمیر' سنگ تراشی' تھیٹر) یا بالواسطہ (شاعری' مصوری' ناچ) موسیقی میں یہ عکس لطیف ترین صورت اختیار کر جاتا ہے۔ تخلیق فن سے بحث کرتے ہوئے لینن نے کہا کہ انسانی شعور میں خارجی حقائق منعکس ہوتے ہیں جو شعور سے علاوہ اپنی ذات میں موجود ہیں۔ انہی حقائق سے فن کار اور ادباء اپنے موضوعات لیتے ہیں اور عمل تخلیق سے انہیں دل کش روپ عطا کرتے ہیں۔ مارکس اور انجلز کو تسلیم ہے کہ فن کار اور ادیب اپنی اپنی شخصی آرزوؤں' تمناؤں' ارمانوں اور ولولوں کا اظہار کرتے ہیں لیکن زندگی کے معروضی احوال کے ساتھ ان کی ذوقی و فکری مطابقت ہو تو ان کی نظموں اور تمثیلوں میں ماحول کی حیات افروز صداقتیں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ مارکس فن برائے فن کا قائل نہیں ہے۔

اس کے خیال میں سچے فنکار اور ادیب اپنے معاشرے کی جاندار قدروں کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اور عوام میں ترقی کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔

اشتراکی انقلاب کے ساتھ انسان دوستی کا ایک نیا تصور ابھرا ہے جس سے نئی جمالیات نے جنم لیا ہے۔ لینن نے گورکی کو پرولتاری ادب کا بانی کہا اور ایک خط میں اسے مشورہ دیا کہ وہ کارخانوں' کھیتوں' شہروں اور دیہات میں جا کر نئی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرے جو نئے اشتراکی معاشرے میں سامنے آ رہی ہے اور جس کی ترجمانی کا حق فنکاروں اور ادیبوں کو ادا کرنا ہے۔ چیئرمین ماؤزے تنگ نے انسان دوستی اور فن کے ربط و تعلق سے بحث کرتے ہوئے لکھا:

> ''ادب و فن نے نوع انسان کی محبت سے جنم لیا۔ محبت کو ایک نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے لیکن اس نوع کے کئی اور بنیادی نکتے بھی ہیں۔ محبت کا تصور خارجی تجربے سے پیدا ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر ہمیں کسی تصور کی بجائے خارجی تجربے کو نقطۂ آغاز بنانا چاہیے۔ جہاں تک نوع انسان کی محبت کا تعلق ہے اس دنیا میں کسی قسم کی اجتماعی محبت کا کوئی وجود نہیں ہے کیونکہ بنی نوع انسان طبقات میں بٹ چکے ہیں۔ اونچا طبقہ تمام انسانوں سے محبت کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ کنفیوشس اور لیو ٹالسٹائے نے اسی محبت کا پرچار کیا ہے لیکن آج تک اس محبت کو عملی جامہ پہنانا ممکن نہیں ہو سکا کیونکہ ایسی محبت طبقاتی معاشرے میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ یقیناً اس نوع کی سچی محبت کی جا سکتی ہے لیکن صرف مستقبل میں جب دنیا سے طبقات مٹ جائیں گے۔ طبقات انسانی معاشرے کو تقسیم کر دیتے ہیں۔ جب یہ طبقات ختم ہو جائیں گے تو معاشرہ خود بخود متحد ہو جائے گا۔ اس وقت یہ محبت پھل پھول سکے گی لیکن آج ایسا نہیں ہو سکتا۔ آج ہم فاشسٹوں سے محبت نہیں کر سکتے' نہ اپنے دشمنوں سے پیار کر سکتے ہیں۔ بھلا ہم معاشرے کی برائیوں سے کیسے محبت کر سکتے ہیں ان برائیوں کو ختم کرنا ہمارا مقصد ہے۔ عوام اس حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ کیا ہمارے ادیب اور فن کار اس بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے؟''

یہ ہے انسان دوستی کا نیا تصور جو اشتراکی معاشرے میں نئی جمالیات کی اساس بن گیا ہے۔

مارکس کے بقول فن و ادب معروضی زندگی کا عکس بھی ہے اور اسکی صالح قدروں کو تقویت بھی دیتا ہے جیسے ہری بھری ٹہنیاں تنے سے نکلتی بھی ہیں اور اسے مضبوط بھی کرتی ہیں۔ جب فن و ادب کی جڑیں بھوری مٹی میں پیوست ہوں گی تو وہ زندگی کا ایک شگفتہ نمونہ بن کر نمودار ہوگا۔ جس طرح پھول زمین سے اپنا رنگ روپ لے کر کھلتا ہے ایسا نہیں ہوتا کہ وہ خاک سے بے رنگ اگتا ہے اور بعد میں اس کی پتیوں پر گلکاری کی جاتی ہے۔ اینجلز کا قول ہے:

> ''مصنف کے ذاتی نقطۂ نظر کا اظہار جتنا مخفی ہوگا' ادب و فن کے لیے اتنا ہی مفید ہوگا۔''

نئی جمالیات کے اجزائے ترکیبی ہیں:

(1) انسان دوستی (2) صداقت (3) حسن

دنیا بھر کے محنت کشوں کی جدوجہد میں شامل ہو کر جبر و استحصال کی زنجیروں کو توڑنا اور حقیقی مساوات کے قیام میں ہاتھ بٹانا انسان دوستی کی شرط اول ہے جس سے کوئی بھی سچا فنکار اور ادیب غافل نہیں رہ سکتا۔ صداقت کا تعلق احساس کے ساتھ اور حسن کا رابطہ اسالیب فن کے ساتھ ہے۔ احساس میں صداقت ہوگی تو اسالیب میں خود بخود دلکشی پیدا ہو جائے گی۔ اشتراکی انقلاب کے بعد بعض جوشیلے دانشوروں نے کہا کہ جمالیاتی اسالیب بورژوا عہد سے یادگار ہیں۔ اس لیے انہیں اشتراکی ادب و فن سے یکسر خارج کر دینا چاہیے۔ لینن نے اس پر گرفت کی اور کہا کہ اسالیب فن کے حسن کو برقرار رکھنا بہر صورت ضروری ہے کیونکہ خوب صورت زندگی کی ترجمانی خوب صورت اسالیب میں ہی کی جا سکتی ہے۔

جاگیر دار معاشرے میں عوام کو کالانعام کہا جاتا ہے اور ان کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ وہ بھی فن و ادب کی برکات سے لطف اندوز ہوں چنانچہ لوک گیتوں' لوک کہانیوں اور لوک کلا کو فنون لطیفہ کے زمرے سے خارج کر دیا گیا اور اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیا گیا کہ کلاسیکی موسیقی' مصوری' شاعری' سنگ تراشی اور تمثیل وغیرہ لوک کلا' لوک ناٹک اور

لوک گیتوں میں سے نکلے تھے۔ ان میں جو بھی کشش اور مٹھاس ہے وہ لوک ورثے ہی کی باقیات سے ہے۔ اشتراکی انقلاب کے بعد لوک ورثے کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا اور اسے محفوظ کرنے کی کوششیں کی گئیں چنانچہ روس' چین اور دوسرے اشتراکی ممالک میں لوک گیتوں' لوک کہانیوں' لوک سنگیت منڈلیوں اور لوک کلا کو نئے سرے سے فروغ دیا جا رہا ہے۔ آج کل کے ارباب بصیرت کہنے لگے ہیں کہ کلاسیکی فنون کا رابطہ لوک ورثے سے ازسرنو محکم کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کے روائتی اسالیب کھوکھلے ہو کر رہ جائیں گے۔

مغرب کے دانش ور اشتراکیوں کے فن و ادب پر طعن کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اشتراکی ممالک میں فن و ادب معاشی احوال کا بے جان عکس بن کر رہ گیا ہے۔ اشتراکی ادیب اور فن کار اجتماعی کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے محنت کشوں سے اپنے کردار لیتے ہیں جس سے ان کی نظموں' قصوں اور تمثیلوں وغیرہ میں عامیانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے یہ معترضین ایسے معاشرے کے برگ و بار ہیں جو بقول سی ایم جوڈ تنزل پذیر[1] ہو کر گل سڑ رہا ہے۔ جس طرح ایک سرمایہ دار اجتماعی مفادات کو ذاتی منفعت پر قربان کر دیتا ہے اس طرح اس معاشرے کے ادیب اور فن کار اپنے ماحول کے سیاسی' معاشی اور سماجی تقاضوں سے قطع نظر کر کے کھوکھلی اور بانجھ تخیل آرائی[2] میں کھو کر رہ گئے ہیں۔ تخیل آرائی دو قسم کی ہوتی ہے:

1. تخلیقی: جس کا نقطۂ آغاز حقائق سے وابستہ ہے۔ اس کے بغیر نہ آرٹ کی تخلیق ہو سکتی ہے اور نہ سائنس کے انکشافات ممکن ہیں۔

2. تجریدی: جو حقائق کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے اور ایک مریضانہ ذہن کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ زوال پذیر مغربی معاشرے کے ادیب اور فن کار کا رشتہ حقائق سے منقطع ہو چکا ہے اور اس کا ذاتی و فطری رابطہ عوامی زندگی سے باقی و برقرار نہیں رہا۔ تجریدی تخیل آرائی کے باعث وہ تاثریت' رمزیت' ماوراء حقیقت پسندی' موجودیت اور بے معنویت کے نام پر "ہاتھی دانت کے برج" میں گھس گیا ہے اور وہاں اپنے ہی رس میں پڑا کھول رہا ہے۔ اس کے احساس کی تازگی اور جذبے کی شگفتگی سلب ہو چکی ہے۔ بیمار موضوعیت نے اسے اجنبیت کے اندھے کنویں میں دھکیل دیا ہے اور اس کے دل و دماغ پر

---

[1] Decadence [2] Fantasy

یاسیت' کلبیت' مردم بیزاری' سنک اور خشونت نے غلبہ پا لیا ہے۔ وہ جنسی انحرافات' جرائم اور اذیت و تشدد سے اپنے موضوع تلاش کرنے لگا ہے۔ اس گروہ میں بادلیئر' پیراں دلو' کافکا' ڈی ایچ لارنس' گرٹروڈ سٹائن' جیمز جائس' مارسل پروست اور ان کی قبیل کے شاعر قصہ نویس اور تمثیل نگار شامل ہیں۔ بورژوا دانش وروں کا یہ دعویٰ کہ ان کے معاشرے میں فنکاروں اور ادیبوں کو آزادی اظہار میسر ہے بوجوہ محل نظر ہے۔ ان کی یہ نام نہاد آزادی روپے کی تھیلی کے تسموں سے بندھی ہوتی ہے۔ کوئی فن کار یا ادیب اپنے معاشی' سیاسی اور سماجی ماحول سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ بورژوا فنکار اپنے معاشرے کی زوال پذیر قدروں کی ترجمانی پر مجبور ہیں۔ اظہار کی آزادی صرف ایک عادلانہ معاشرے ہی میں میسر آ سکتی ہے جو استحصال سے پاک ہو اور جس میں فنکار کو اپنی ذمے داری اور اپنے مقام کا احساس بھی ہو۔

بورژوا فن کار اور ادیب کہتے ہیں کہ فن کار کی حقیقت معروضی حقیقت سے مختلف ہوتی ہے لہٰذا اس کا فن حقیقی عالم کا عکس نہیں ہے بلکہ ان کے تخیل کی تخلیق ہے جو خارجی حقائق سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ہم نے فن و ادب کے نئے نئے رجحانات دریافت کر لیے ہیں اور اسے وہ جدیدیت کا نام دیتے ہیں۔ ہم تھوہر کے کڑوے پھل کو تازہ کہہ سکتے ہیں لیکن وہ اس پھل جیسا خوش ذائقہ تو نہیں ہو سکتا جو سیب کے درخت سے لگتا ہے۔ بورژوا معاشرے کے فن و ادب اور اشتراکی معاشرے کے فن و ادب میں یہی فرق ہے۔ بورژوا ادیبوں اور فنکاروں کی جدیدیت سنک اور فرار کی زائیدہ ہے جب کہ اشتراکی معاشرے کی جدیدیت حیات افروز اور قوت بخش ہے۔

مغرب کے مشہور دانشور آلڈس ہکسلے نے ایک مشہور نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس معاشرے میں امن و امان ہو' بھوک اور احتیاج کا خاتمہ کر دیا گیا ہو' معاشی اور جنسی مجبوریاں اور محرومیاں موجود نہ ہوں' اس میں فنکاروں اور ادیبوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو تحریک نہیں ہوتی اور وہ ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں چنانچہ اس کے بقول اسی لیے اشتراکی معاشرے میں تخلیق فن و ادب کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ اس نوع کا استدلال بورژوا دانش وروں کی ذہنی پراگندگی اور محض تعصب کا ایک روشن ثبوت ہے' گویا آلڈس ہکسلے کے خیال میں

فن و ادب کے فروغ کے لیے بھوک' احتیاج' عصمت فروشی' گداگری اور جرائم کا ہونا ضروری ہے۔اس کا اصل مدعا جسے وہ سوفسطائی استدلال کے پردے میں چھپانا چاہتا ہے' یہ ہے کہ بورژوا معاشرے کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اسے عادلانہ معاشرے میں بدلنے کی کوشش کی گئی تو فن و ادب کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آلڈس ہکسلے کے ہمنوا یہ کہتے نہیں تھکتے کہ جن ممالک میں اشتراکی معاشرے کا قیام عمل میں آیا ہے۔ان سے بلند پایہ ادیب شاعر' تمثیل نگار اور قصہ نویس غائب ہو گئے ہیں۔ ظاہراً یا تو یہ معترضین' اشتراکی فن و ادب سے ناواقف ہیں یا پھر عادتاً تعصب سے بے جا کام لے رہے ہیں۔ روسی فن و ادب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ روس کے شاعروں' تمثیل نگاروں' قصہ نویسوں' موسیقاروں' رقاصاؤں اور فلمی ہدایت کاروں نے انقلاب کے بعد فن و ادب کے گرانقدر شاہکار پیش کیے ہیں۔ میکسم گورکی' الیکسی ٹالسٹائے' الیا اہرنبرگ' شولوخوف' فرمانوٹ' فیدیف' فیدن' شش کوف' حزہ' سمونوف' گونچار' اوسٹروفسکی (ناول' تمثیل' افسانہ) ایمل کرونکی' (مزاح) مایاکوفسکی' بلوک' انٹوکولسکی' زارف' سوٹلوف' (شاعری) کاسیکن' آرفی' پوف' للستی رون' (شبیہ نگاری) نجشیف' گرامبر (منظر نگاری) گری کوف (جنگی مناظر کی تصویر کشی) انڈریف' مانیزر (مجسمہ تراشی) دنیا بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ سوویت روس میں پانچ سو پیشہ ورانہ تھیٹر ہیں۔ جن میں ہر سال سینکڑوں تمثیلیں کھیلی جاتی ہیں بولشوئی تھیٹر میں سپارٹاکس' سوین لیک اور خوابیدہ شہزادی جیسے عظیم بیلے پیش کیے گئے ہیں۔ اوپیرا اور بیلے میں چالیاپن' نژادانووا' لوبی نوف مشہور و معروف ہیں۔ اوپیرا اور بیلے کے موسیقاروں چیکوفسکی' گلنکا' ورگومژگی' موسوگسکی کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ باخ' بیٹ ہوون' موتسارٹ' منڈل سوہن' شوبرٹ اور شوپن وغیرہ کلاسیکی موسیقاروں کے نغمے ذوق و شوق سے سنے جاتے ہیں۔ سرکس عوامی تفریح کا ایک بہت بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ سینما کی ترقی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دنیا بھر کی چوٹی کی بارہ فلموں میں تین سوویت روس میں بنائی گئی ہیں۔ روسی فلم پوٹمکن کو سینما کا عظیم ترین شاہکار سمجھا جاتا ہے دنیا بھر کی وسیع کینوس پر بنائی ہوئی فلموں میں روسی فلم "جنگ اور امن" عظیم ترین ہے۔ روسی ہدایت کار پڈوفکن' آئسن سٹائن اور ڈوژنکو نے ابداع اور جدت طرازی سے سینما کو عظیم آرٹ بنا دیا ہے۔

اشتراکی ممالک میں مغرب کے ان شاعروں' قصہ نویسوں اور تمثیل نگاروں کی کتابیں بڑے اہتمام سے شائع کی جاتی ہیں۔ جنھوں نے بورژوازی کی اجلہ فریبی' ریاکاری اور مکاری کو بے نقاب کیا ہے اور اپنے معاشرے کے تضادات کو نمایاں کر کے دکھایا ہے۔ ان میں تھیوڈور ڈریسر' سٹیفن زوانگ' رومیں رولاں' ٹامس مان' جارج برنارڈ شا' لیون فیوش وینگر' روجر مارٹن دوگار' آرنسٹ ہیمنگوے خاص طور پر مقبول ہیں۔ اشتراکی ملکوں میں کلاسیکی شاہکاروں کے خوب صورت ایڈیشن لاکھوں کی تعداد میں چھپتے اور ذوق و شوق سے خریدے جاتے ہیں۔ ان عظماء میں اسکیلس' ارسٹوفینس' شیکسپیئر' مولیئر' سروانٹیز' لیو ٹالسٹائے اور بالزک کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس رواج و قبول کا راز ان کی انسان دوستی میں ہے۔ جس کے باعث قدیم و جدید کا فرق مٹ جاتا ہے کیونکہ حقیقی فن و ادب جدید ہوتا ہے خواہ وہ آج سے ایک ہزار برس پہلے کا ہو اور تمام غیر حقیقی ادب و فن فرسودہ ہوتا ہے خواہ وہ آج کل ہی کی تخلیق ہو۔

اشتراکیوں نے دنیائے فن و ادب میں دو گرانقدر اضافے کیے ہیں۔

(1) ترقی پسندی کی تحریک (2) نیا المیہ

ترقی پسندی کی تحریک:

ادب و فن میں حقیقت پسندی کا آغاز رومانیت کی رقیق جذباتیت اور غرابت کے خلاف ردعمل سے ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں عوام کی بیداری کے ساتھ اہل قلم کو بھی جن کی اکثریت نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ عوامی زندگی سے دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہوگئی اور یورپ کے شاعر' قصہ نویس اور تمثیل نگار روزمرہ کی عوامی زندگی کی تصویر کشی کرنے لگے۔

فرانس میں بالزک' انگلستان میں ڈکنز اور روس میں گوگل اس تحریک کے بلند پایہ ترجمان تھے۔ 20ویں صدی کے ابتدائی سالوں میں اشتراکیت کے فروغ کے ساتھ حقیقت پسندی میں انقلابیت کا عنصر پیدا ہوا اور اسے ترقی پسندی کا نام دیا گیا۔ ترقی پسند قصہ نویسوں' شاعروں اور تمثیل نگاروں کا عقیدہ تھا اور ہے کہ حیات ایک تخلیقی عمل ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی فنی صلاحیتوں کو پوری طرح پنپنے کے مواقع دیے جائیں اور

اس دنیا کو بنی نوع انسان کے لیے خوب صورت اور دلآویز ٹھکانا بنایا جائے۔ اشتراکی معاشرے میں پہلی بار محنت کش بطور ہیرو کے ظاہر ہوا۔ جس کے انقلابی عزائم کا اظہار ترقی پسند ادب میں ہوتا ہے۔ ترقی پسندوں نے جذبۂ عشق و محبت کی ترجمانی نئے انداز میں کی۔ روائتی عشقیہ کہانیوں کی طرح ان کے قصوں میں اتھاہ یاسیت' المناک بے بسی اور افسردگی کا کھوج نہیں ملتا بلکہ جذبۂ عشق ان کے کرداروں کو مثبت انداز میں متاثر کرتا ہے۔ اصطلاح میں اسے رومانوی حقیقت پسندی کہا گیا ہے۔ روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد ترقی پسندی کی تحریک ایشیاء افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ملکوں میں دور دور تک پھیل گئی۔ چنانچہ ان پس ماندہ اقوام کے ادباء و شعراء انقلاب پسندوں کے دوش بدوش عوامی جدوجہد میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ ترقی پسند دانشوروں' فن کاروں اور ادیبوں پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ انہیں اپنی فکر' فن اور ادب سے اظہار ذات کے ساتھ ساتھ عوام کی ذہنی تربیت اور رہنمائی کا فرض بھی انجام دینا ہے۔ ان کے فن و ادب میں نئے انسان کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو معاشرے کو بدلنے کی کوشش میں خود بھی بدلتا جا رہا ہے۔ ترقی پسندی کے بانی میکسم گورکی کا قول ہے:

> "یہ حقیقت نگاری ان لوگوں کی ہے جو دنیا کو بدل کر اسے نئے سرے سے تخلیق کر رہے ہیں۔"

اناطول لوناچرسکی نے میکسم گورکی کے بارے میں کہا:

> "میکسم گورکی کی ادبی تخلیقات میں پرولتاریہ کو پہلی بار فنی شعور حاصل ہوا ہے جیسے سیاسی و فکری شعور مارکس اور اینجلز کی تحریروں سے ارزانی ہوا تھا۔"

زوانگ نے میکسم گورکی کے قصوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ گورکی کے ناولوں میں پہلی بار چلتے پھرتے جاندار کردار نمودار ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کے قصوں میں انسانوں کے محض سائے دکھائی دیتے تھے۔ یہی بات ہم تمام ترقی پسند ادیبوں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں فیض احمد فیض کی شاعری ملک راج آنند اور کرشن چندر کے ناولوں اور کہانیوں میں مقامی رنگ بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ دنیا بھر کے محنت کشوں کے عزائم کی ترجمانی کا حق بھی ادا کیا گیا ہے۔

نیا المیہ:

نیا المیہ ترقی پسند تحریک کی ایک گرانقدر دین ہے۔ المیہ کا آغاز یونان قدیم میں اسکیلس، سوفوکلو اور یوری پیڈیز کی تمثیلوں سے ہوا تھا۔ جن میں ہیرو کو مقدر یا دیوتاؤں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس آویزش میں ہیرو کی شکست یقینی ہے اور اسے اس بات کا شعور بھی ہے کہ ہار میرا مقدر بن چکی ہے لیکن اس کے باوجود وہ نامساعد حالات کا جی توڑ کر مقابلہ کرتا ہے۔ سٹیج پر اس روح فرسا کشمکش کا نظارہ کرنے سے بقول ارسطا طالیس ناظرین کے جذبات کی تنقیح ہو جاتی ہے۔ نشاۃ الثانیہ کی صدیوں میں تمثیل کا احیاء ہوا تو شیکسپیئر اور ریسین کے المیئے میں اس بنیادی کشمکش کا رخ انسانوں کی طرف ہو گیا اور وہ مقدر کی بجائے خم ٹھونک کر ایک دوسرے کے مقابلے میں آ گئے۔ اس المیئے میں ہیرو آخر وقت تک جان لڑا دیتا ہے اور پورے عزم و حوصلے کے ساتھ موت کا سامنا کرتا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدیوں میں المیہ کی آویزش کا رخ انسان کی اپنی ہی ذات کی جانب مڑ گیا۔ اس کا ہیرو داخلی ونفسیاتی جبر کے تحت اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ ابسن کی تمثیلوں میں اس المیہ کا کھوج ملتا ہے۔ اشترا کی معاشرے کا ہیرو مسکراتے ہوئے موت کا خیر مقدم کرتا ہے۔ وہ حیات بعد موت پر عقیدہ نہیں رکھتا اور بخوبی جانتا ہے کہ میں اس جنگ میں مارا گیا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جاؤں گا لیکن وہ محض اس لیے اپنی جانِ عزیز کی قربانی دیتا ہے کہ اس کے ساتھی آزادی اور آسودگی کی زندگی بسر کر سکیں۔ اسٹروسکی کے ناول ''لوہا فولاد کیسے بنا'' کا کردار پیول کورچاگن، شولوخوف کے ناول ''بنجر دھرتی کھود دی گئی'' کا ڈیوی ڈوف اسی ادیب کے ناول ''انسانی مقدر'' کا آندرے سولوکوف اس نئے المیہ ہیرو کی مثالیں ہیں۔ اشترا کی المیے کا بنیادی موضوع انقلاب ہے۔ اس میں ہیرو جو المناک صورت حالات تخلیق کرتا ہے وہ اساسی طور پر انقلابی ہے۔ انقلابی جدوجہد اور انقلابی مجادلہ ہی اس نئے المیے کا مرکزی نقطہ ہے۔ یہ ہیرو عوام کی صفوں سے آتا ہے اور کلاسیکی ہیرو کی طرح اعلیٰ طبقے کا فرد نہیں ہے۔ وہ ایک محنت کش ہے جو اپنی انقلابی سرگرمیوں سے جبر و استحصال کا خاتمہ کرنے پر مستعد ہے۔ یہ احساس کہ ''میں عوام میں سے ہوں'' اس ہیرو کے دل میں اپنی فتح کا یقین محکم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ یونانی ہیرو کی

طرح مقدر کے خلاف نبرد آزما نہیں ہوتا بلکہ احوال کے جبر میں اختیار کو پالیتا ہے۔ وہ سوچ سمجھ کر اپنی راہ عمل کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے اور اپنی قسمت خود بنانا چاہتا ہے۔ اسے اپنے مؤقف کی صداقت کا شعور ہے۔ وہ اپنی جان نثار کر کے انقلاب کی راہ ہموار کرنے کا خواہاں ہے اور ان تمام رکاوٹوں پر قابو پانے کے لیے جدوجہد کرتا ہے جو ترقی اور مساوات کے راستے میں حائل ہیں۔ اشتمالی نصب العین اس کے دل میں جوش اور ہمت پیدا کرتا ہے۔ تاہم یہ المیہ سراسر سماجی نہیں ہے بلکہ اس میں شخصی اور نفسیاتی عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ اس ہیرو کی موت سے ناظرین اور قارئین اپنی روح کی گہرائیوں تک متاثر ہوتے ہیں اور ان کے دلوں میں ظلم و استحصال کو ختم کرنے کا ولولہ جوش مارنے لگتا ہے جو ان کے لیے تنقیح نفس کا باعث ہوتا ہے۔ کلاسیکی المیہ یاسیت آمیز ہے کیونکہ موت اور مقدر ہی اس کا اصل موضوع ہے۔ اشتراکی المیے میں اس پہلو سے رجائیت کا عنصر پیدا ہو گیا ہے کہ ہیرو موت کا سامنا کرتے وقت اپنے رجائی نصب العین پر بھرپور عقیدہ رکھتا ہے۔ سمونوف کی ''روسی'' لیونوف کی ''حملہ'' کورنی چک کی ''محاذ'' جیسی تمثیلوں میں نئے انقلابی المیے اور اس کے ہیرو کی ولولہ انگیز مثالیں ملتی ہیں۔ وکٹر روزف کی تمثیلوں ''آسودگی'' اور ''خوش بختی'' میں اشتراکیوں کی نئی نسل کو بتایا گیا ہے کہ ان کے آباء نے کس طرح ظالموں کے خلاف مردانہ وار لڑتے ہوئے اپنی جانیں خوش دلی سے نچھاور کی تھیں تاکہ ان کے بیٹے، پوتے اور ساتھی آسودگی، آزادی اور مسرت کی زندگی گذار سکیں۔

نئی عورت:

ہم نے پہلے باب میں زرعی انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے نفوذ سے قدیم اشتمالی معاشرے میں عورت کو جو مرکزی مقام حاصل تھا وہ ختم ہو گیا اور شخصی املاک کے رواج و قبول کے ساتھ عورت بھی مرد کی املاک بن کر رہ گئی۔ غلامی اور جاگیرداری نظام معاشرہ میں عورت کی حالت زار و زبوں تھی؛ مرد خود تو اپنی ہوا و ہوس کی تسکین کے لیے آزاد تھا لیکن اپنی زوجہ کو معمولی سی لغزش پر بھی قانوناً جان سے مار دینے کا مجاز تھا۔ باندی اور قحبہ کی صورت میں عورت کا نہایت بے رحمی اور ڈھٹائی کے ساتھ استحصال کیا گیا۔ لڑائیوں کے دوران میں مفتوحہ اقوام کی ہزاروں بہو بیٹیوں کو باندیاں بنا

کر حرم سراؤں کی زینت بنا لیا جاتا تھا یا انہیں سر بازار بھیڑ بکریوں کی طرح نیلام کر دیتے تھے۔ سلاطین اور امراء کی حرم سراؤں میں خواجہ سراؤں کا کڑا پہرہ ہوتا تھا۔ ان باندیوں میں چند ایک ہی اپنے آقا کی خلوت میں باریاب ہوتی تھیں۔ باقی حسرت و حرمان کی آگ میں پڑی جلتی تھیں۔ اس بے بسی کے عالم میں اگر کوئی باندی کسی سے معاشقہ کرتی تو اس کی گردن ماردی جاتی تھی۔ اس کے باوجود عورت کو گناہ کی پتلی قرار دیا گیا۔ اقوامِ عالم کے ادب و شعر میں عورت کی ہوسنا کی' بے وفائی اور مکر و فریب کے قصے مزے لے لے کر بیان کیے گئے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اکثر مصلحین اخلاق و مذہب نے بھی عورت کو گناہ کا پتیرہ کہا ہے اور بردہ فروشی کو جائز قرار دیا ہے۔ عورت کے استحصال کی دوسری شرمناک صورت قحبگی ہے جس کا آغاز معبدوں سے ہوا تھا۔ دھرتی دیویوں کے مندروں میں ہزاروں دیوداسیاں رکھی جاتی تھیں جو پجاریوں اور یاتریوں کے تصرف میں آتی تھیں اور جن کی خرچی پروہت وصول کرتے تھے۔ مصر' بابل اور سمیریا میں حسین لڑکیاں بعل' مولک' اوزیرس وغیرہ دیوتاؤں کی زوجیت میں دی جاتی تھیں جن سے ظاہراً پروہت تمتع کرتے تھے۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اس ''مقدس قحبگی'' کے پہلو بہ پہلو کاروباری لوگوں نے قحبہ خانے کھول دیے اور باندیوں سے عصمت فروشی کا دھندا کرنے لگے۔ صنعتی انقلاب کے بعد انیسویں صدی میں غلامی کو قانوناً ممنوع قرار دیا گیا لیکن بورژوا معاشرے میں عصمت فروشی کا کاروبار آج بھی پورے عروج پر ہے۔

صنعتی انقلاب کے بعد عورتیں کارخانوں میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنے لگیں تو انہیں اپنے اصل مقام کا شعور ہونے لگا۔ عالم گیر جنگوں میں جب سامراجیوں نے لاکھوں جوانوں کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا تو عورتوں نے اکثر شعبوں میں مردوں کے کام سنبھال لیے جس سے آزادیٔ نسواں کی تحریک زور پکڑ گئی اور عورت کو پہنائی ہوئی زنجیریں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ اشتمالی انقلاب کے بعد روس' چین اور دوسرے اشتراکی ممالک میں عورت حقیقی معنوں میں آزاد ہو گئی ہے اور اسے مرد کے مساوی ہر قسم کے حقوق مل گئے ہیں لیکن یورپ اور شمالی امریکہ کی عورت نے آزادی کا مطلب یہ لیا ہے کہ میں بھی مرد ہی کی طرح ہر نوع کی جنسی بے راہ روی اور ہوسناکی کا حق رکھتی ہوں۔ سامراج کے پھیلاؤ اور سرمایہ کاری میں اضافے کے ساتھ عصمت فروشی کے کاروبار کو بھی وسیع پیمانے پر

ازسرِ نو منظم کیا گیا ہے۔ نیویارک' شکاگو' پیرس' برلن' ہانگ کانگ اور سنگاپور جیسے بڑے بڑے شہروں میں عصمت فروشی کے سینکڑوں اڈے موجود ہیں۔ بعض قحبہ خانے سرکاری تحویل میں کھولے گئے ہیں جہاں "صحت مند تفریح" کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ مغربی جرمنی میں ہامبرگ کا وسیع قحبہ خانہ اس کی معروف مثال ہے۔ یورپ اور امریکہ میں امیر کبیر عیش پسندوں کو ہوائی جہازوں میں کوہستانی تفریح گاہوں میں پہنچایا جاتا ہے جہاں وہ بھاری رقمیں خرچ کر کے کسبیوں سے جی بہلاتے ہیں۔ ہر سال سینکڑوں سفید فام کسبیوں کو ایشیا اور افریقہ کے ممالک سے برآمد کیا جاتا ہے۔ اسے "سفید غلامی کا کاروبار"[1] کہتے ہیں۔ اضلاع متحدہ امریکہ میں بادفرنگ جیسے جنسی امراض وبائی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ دوسری جنگ عالمگیر کے دوران جہاں کہیں بھی امریکی سپاہی گئے وہیں یہ امراض پھیل گئے۔ جرمنی' جاپان' تھائی لینڈ' فلپائن اور ملایا کے باشندے آج تک "امریکی طرز حیات" کا مزہ چکھ رہے ہیں۔ یورپ اور شمالی امریکہ کے بڑے بڑے شہروں کی شبانہ تماشا گاہوں میں جنسی کجرویوں کے فحش مناظر برسرِ عام دکھائے جاتے ہیں جنہیں نیلی فلموں میں محفوظ کر کے ایشیا اور افریقہ کو برآمد کیا جاتا ہے۔ سویڈن' ناروے' ڈنمارک' فرانس اور شمالی امریکہ میں نفسیات کے نام پر کھلم کھلا جنسی آزادی کی تلقین کی جا رہی ہے۔ اہل مغرب کے دل و دماغ پر فی الوقت دو خبط سوار ہیں:

(1) زراندوزی (2) جنسی ہوسناکی

دولت کے حصول اور جنسی ہوسناکی کی تشفی کے لیے چاروں طرف مجنونانہ دوڑ دھوپ کا سماں دکھائی دیتا ہے۔ لینن نے سچ کہا تھا کہ:

"جنس کا خبط بورژوا کا معمول ہے۔"

ابراہیم لنکن کا قول ہے کہ:

"تم کسی شخص کو اپنے آپ کو آلودہ کیے بغیر گندی نالی میں دبا کر نہیں رکھ سکتے۔"

یورپ اور شمالی امریکہ میں عصمت فروشی کا وسیع کاروبار کرنے والوں نے جہاں عورت کو پستی کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ وہاں خود بھی اخلاقی پستی کا شکار ہو گئے ہیں۔

---

1 White Slave Traffic

مردعورت کی حقیقی مساوات اسی معاشرے میں قائم کی جا سکتی ہے جس میں عورت کو جنس بازاری نہ سمجھا جائے اور اسے شخصیت کی تعمیر کے بھرپور مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ اشتراکی دانشور اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں چنانچہ روس، چین اور دوسرے اشتراکی ممالک میں انقلاب کے بعد پہلا کام یہ کیا گیا کہ عصمت فروشی کا قلع قمع کر دیا گیا۔ لارڈ پاس فیلڈ لکھتا ہے:

"روسی انسان کی تشکیلِ نو میں لینن اور اس کے ساتھیوں نے آدم سے نہیں حوا سے اپنا کام شروع کیا تھا۔"

سوویت روس کے ضابطہ فوجداری میں ہر اس شخص کو جو عصمت فروشی میں ملوث ہو پہلے جرم پر کم از کم تین سال کی سزا تجویز کی گئی ہے اور ہر وہ مرد جو یہ جانتے ہوئے کہ اسے بادِ فرنگ یا کوئی اور جنسی مرض لاحق ہے کسی کے ساتھ خلوت میں جائے تو اسے سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ ان قوانین کا نفاذ اس سختی سے کیا گیا کہ انقلاب کے ایک ہی سال بعد کسبی ناپید ہو گئی۔

انقلاب چین سے پہلے 1945ء میں صرف شنگھائی میں پانچ سو بڑے قحبہ خانے موجود تھے۔ جن میں چار لاکھ چھ ہزار کسبیوں سے دھندا کروایا جاتا تھا۔ ان کی عمر بالعموم بارہ اور چودہ برس کے درمیان ہوتی تھی۔ قحط زدہ علاقوں میں بردہ فروش چاول کے چند تھیلوں کے عوض نوخیز لڑکیاں خرید لاتے تھے جنہیں قحبہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔ ان لڑکیوں کو اس بے دردی سے پیٹا جاتا تھا کہ ہر سال ایک ہزار جانیں ضائع ہو جاتی تھیں اور پولیس خاموش تماشائی بنی دیکھتی رہتی تھی۔ انقلاب کے بعد یہ قحبہ خانے بند کر دیے گئے اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص کسی کسبی سے نکاح کر کے اسے عزت و آبرو کی زندگی گذارنے میں مدد کرے گا اسے دوسرے شہریوں سے زیادہ احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا چنانچہ قلیل عرصے میں ہی لاکھوں بدنام کسبیاں ذی عزت بیویاں بن گئیں۔ اشتراکیوں نے کسبی کو سنگین جرم قرار دیا اور مرد عورت کی مساوات قانوناً نافذ کر دی گئی۔[1]

کسبی کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے مغرب کے دانشور اور علمائے نفسیات عام طور سے نفسیاتی عوامل پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسبیاں پیدائشی مجرم ہوتی ہیں۔

1. The Useless Sex Oriana Fallaci

اور لاشعوری جبر کے تحت عصمت فروشی کرتی ہیں۔ اشتراکی دانشوروں نے اس نظریے سے اختلاف کیا اور کہا کہ قحبگی کا اصل سبب معاشی ہے اور غریب اور بے سہارا لڑکیاں بھوک تنگ سے مجبور ہو کر قحبگی کا پیشہ اختیار کرتی ہیں۔ اشتراکیوں نے اس نظریے کو عملاً درست ثابت کر دکھایا ہے۔ جب کہ مغربی ممالک میں نفسیات کے نام پر قحبگی کا جواز پیش کیا گیا ہے۔ وہ معاشی اسباب سے اس لیے بحث نہیں کرتے مبادا ان کے استحصال کی بھیانک صورت سامنے آ جائے۔ ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے کہ اہل مغرب فحاشی اور عصمت فروشی کو وسعت دے کر دانستہ اپنے نوجوانوں میں جنسی بے راہ روی پیدا کر رہے ہیں تاکہ نوجوان سیاسی اور معاشی مسائل سے غافل ہو جائیں۔ اشتراکی معاشرے میں عورتوں کو بھی مردوں کی طرح محنت کرنا پڑتی ہے۔ جس سے وہ ذہنی پراگندگی سے محفوظ رہتی ہیں اور مغربی عورت کی طرح جنسی کشش کا خبط انہیں پریشان نہیں کرتا۔ اطالیہ کی صحافی اور دانشور خاتون اوریانا فلاچی اپنے سیاحت نامے میں لکھتی ہیں:

> "اشتراکی چین میں عورتیں مرد سب ایک جیسا لباس پہنتے ہیں۔ چین میں دس میں سے تین عورتیں جج ہیں۔ صرف پیکن یونیورسٹی میں ڈھائی ہزار خواتین پڑھاتی ہیں۔ پچاس فیصد عورتیں بڑے بڑے کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔ 1957ء میں دو لاکھ عورتوں نے مل کر ایک پورا پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیا تھا اور اس کے پتھروں سے بند تعمیر کیا تھا۔ پتھر ڈھوتے وقت کم و بیش نصف تعداد نے اپنے سروں پر ٹوکریاں اٹھا رکھی تھیں اور اپنے شیر خوار بچوں کو اپنے کاندھوں سے جکڑ رکھا تھا۔ چین میں شوہر اور بیوی کی مساویانہ حیثیت کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا ہے۔ آج کل اشتراکی چین میں عشق کا وہ تصور نہیں ملتا جو مغربی ممالک اور ایشیا میں رائج ہے۔ ہین سویاں نے کہا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اشتراکی چین میں آزاد معاشقے کرنے کی آزادی ہے وہ غلطی پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے چینیوں کا اخلاق بہت بلند ہے۔ شادی کے بغیر عشق کا اظہار معیوب سمجھا جاتا ہے اور بدکاری ایک سنگین جرم ہے۔ محبت کرنے والے بے تکلف بیاہ کر لیتے ہیں۔ طلاق شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ ایک چینی عورت نے سمون و بوا سے کہا تھا

"انقلاب نے ہمیں عشق سے نجات دلائی ہے۔"

چینی عورت کا یہ قول بڑا خیال انگیز ہے۔ رومانی عشق عورت کے لیے ایک بندھن بنا رہا ہے اور اس معاشرے سے یادگار ہے۔ جس میں عورت کو ایک رنگین جنسی گڑیا سمجھا جاتا تھا۔ مرد کو جب کوئی عورت پسند آجاتی اور اس سے تمتع کرنے میں ناکام ہوتا تو اسے رام کرنے کے لیے اپنے ازلی عشق کے گیت سناتا۔ اس کے حسن و جمال کو چاند تاروں سے جا ملاتا۔ اسے رنگ برنگ کے پھولوں سے تشبیہ دیتا۔ اس کے بدن کی رعنائی اور چہرے کی زیبائی کے راگ الاپتا مگر فیض یاب ہونے کے بعد اسے دھتا بتا دیتا اور کسی دوسری "پری چہرہ ماہوش" کے تعاقب میں سرگرم ہو جاتا۔ اسی دور سے عورت مرد کو رجھانے کے لیے اپنے ہار سنگھار میں غلو کرتی رہی ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات نقش کر دی گئی تھی کہ اس کی زندگی کا واحد مقصد مرد کی توجہ کو جذب کرنا اور اس کے جی کو خوش کرنا ہے۔ باندیاں یا کسبیاں تو خیر اپنے آقا یا سرپرست کی دلجوئی پر کمربستہ رہتی ہی تھیں بیاہتا عورت کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ اسے بھی ہر لمحے یہی فکر لاحق رہتی تھی کہ اس کا شوہر کسی دوسری عورت کے حسن پر مائل نہ ہو جائے۔ اشتراکی انقلاب کے بعد عورت نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اپنی شخصیت کو جان لیا اور گڑیا کا کردار ترک کر دیا۔ اس بدلتے ہوئے سماجی اور معاشی ماحول میں رومانی عشق کے کلاسیکی تصور کا مجروح ہو جانا عین فطری امر تھا۔ اشتراکی معاشرے میں پیار کرنے والے بلا تامل بیاہ کر لیتے ہیں اور ہجر و فراق کی آگ میں بھسم ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ اس معاشرے کے جوان عورت، مرد جو ذہنی اور جسمانی لحاظ سے تندرست و توانا ہوتے ہیں قدرتاً ایک دوسرے میں جنسی کشش محسوس کرتے ہیں۔ جو ذوقی اور ذہنی لگاؤ کے ساتھ مل کر پیار کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ معاشرہ چاہنے والوں کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ باہمی احترام، مساوات کا احساس اور جنسی توافق میاں بیوی کو گہری مسرت سے سرشار کر دیتا ہے۔ یہ انس یہ لگاؤ ہی اس معاشرے کا عشق ہے۔ یہ دیکھ کر چنداں حیرت نہیں ہوتی کہ بورژوا معاشرے کی بہ نسبت اشتراکی معاشرے کی عورتیں زیادہ بامسرت ازدواجی زندگی گذار رہی ہیں۔ طلاق بہت کم وارد ہوتی ہے اور ایسی طالع آزما عورتوں کا کوئی وجود نہیں ہے جو بورژوا معاشرے میں امیر کبیر لوگوں سے بھاری رقمیں مہر میں وصول کرنے کے لیے نکاح کرتی ہیں۔ انہوں نے مردوں کے دوش بدوش انقلابی

سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انہی کی طرح قربانیاں دینے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ ہم مختصراً چند انقلاب پسند خواتین کا ذکر کریں گے۔

اگلی صف کے انقلابیوں میں کلارا زٹکن' روز الکسمبرگ' کیتھرین بریشکوفسکی' ویرا فگز' ایما گولڈ مین' کوپس کایا' جینی مارکس' سونیا' فلرت شینخ' یانگ کوئی ہوئی' تسی ہنگ کانگ کے چنگ اور ہوتسوچن جیسی حوصلہ مند اور دلیر خواتین شامل ہیں۔ فرانز مہرنگ' نے کلارا زٹکن اور روز الکسمبرگ کو انقلابی تحریک کے ممتاز ''جواں مرد'' کہا ہے۔[1]

کارل مارکس کی زوجہ جینی رؤسا کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ پرجوش انقلابی تھی جو عمر بھر اپنے شوہر کے ساتھ سرگرم عمل رہی۔ اس نے اپنے انقلابی نصب العین کے لیے تن من دھن سب کچھ لٹا دیا۔ یہ ناز پروردہ' نازک اندام' خوشحال خاتون کئی سال افلاس و احتیاج کی کڑیاں خندہ پیشانی سے جھیلتی رہی اور ہر آڑے وقت میں اپنے عظیم اور درویش صفت خاوند کا سہارا بنی رہی۔ لندن میں برسوں تک اس کا گھر یا صحیح معنوں میں ''غریب خانہ'' یورپ بھر کے معذور انقلابیوں کی پناہ گاہ بنا رہا۔ وہ مارکس کے مسودے اپنے ہاتھ سے صاف کیا کرتی تھی۔

لینن کا سارا خاندان انقلابی تھا۔ اس کے بڑے بھائی الگزانڈر کو انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں موت کی سزا دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد لینن کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی ماں اپنے بیٹے سے ملنے جیل گئی تو داروغہ نے طنزاً کہا:

''تمہیں اپنے بیٹوں پر فخر کرنا چاہیے۔ ایک پھانسی پا چکا اور دوسرا پانے ہی والا ہے۔''

لینن کی ماں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تمکنت سے کہا:

''ہاں مجھے اپنے بیٹوں پر فخر ہے۔''

لینن کی بہن میریا پراوڈا کے دفتر میں اہم فرائض انجام دیتی رہی۔

کیتھرین بریشکوفسکایا (1844ء-1934ء) انقلابی کمیونسٹ پارٹی کے دائیں بازو سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ ایک جاگیردار گھرانے کی فرد تھی جس نے ناز و نعمت میں پرورش پائی تھی۔ ایک دن اس کی ملاقات نوجوان پیٹر کروپٹکن سے ہوئی جو اپنی دولت پر لات مار کر

---

1. Karl Marx

عوام کے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ کیتھرین اس کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوئی کہ رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ چھوڑ دیا اور محنت کشوں کی صف میں شامل ہوگئی۔ زار کی حکومت نے انقلاب پسندی کے جرم میں اسے گرفتار کرلیا اور سائبیریا کو جلاوطن کر دیا جہاں ایک امریکی صحافی سے باتیں کرتے ہوئے اس نے کہا:

> "ممکن ہے جلاوطنی میں ہمیں موت آجائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے بچے بھی جلاوطنی ہی میں مر جائیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارے بچوں کے بچے بھی یہیں مرمٹ جائیں لیکن اس جدوجہد کا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور نکلے گا۔ ایک عظیم دور آ رہا ہے۔ اس دور کی آمد کو میں اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتی ہوں۔ ایسا دور جس میں اقوامِ عالم ایک ہو جائیں گی اور نوعِ انسان ایک خاندان بن جائے گی۔"

روزا لکسمبرگ ایک ممتاز دانشور خاتون تھی۔ اس نے پولینڈ اور جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کی۔ اسے مزدوروں کو منظم کرنے کے الزام میں جنوری 1919ء میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

البانیہ کے وزیرِاعظم انور ہوکسا (خواجہ) کی نائب مادام فکرت شینخو 1943ء میں فوج کے اس دستے میں شامل تھی۔ جو نازیوں کے خلاف لڑ رہا تھا اور جس کی قیادت شینخو کے ہاتھوں میں تھی۔ بعد میں فکرت نے شینخو سے بیاہ کرلیا۔ فکرت نے میدان جنگ میں بہادری اور ثابت قدمی کے زریں کارنامے انجام دیئے اور اپنے شوہر کی طرح شجاعت کے کئی تمغے حاصل کیے۔ بلغاریہ کی مشہور انقلابی خاتون سونیا 1919ء میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوئی۔ چھ برس کے بعد اسے موت کی سزا سنائی گئی جو بعد میں عمر قید میں تبدیل ہوگئی۔ سونیا جیل سے فرار ہوگئی۔ 1923ء میں اس کے باپ کو پولیس نے گولی مار دی۔ 1925ء میں پولیس سونیا کو گرفتار کرنے آئی تو اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے گولیاں برسائیں اور کئی پولیس والوں کو ہلاک کر دیا۔ آخر پولیس نے اس کے کمرے میں بم پھینکے اور ان کے دھماکوں کے خاتمے پر لپک کر اندر گھس گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ سونیا لہولہان زمین پر پڑی ہے۔ اسے آٹھ شدید زخم آئے تھے لیکن جان ہنوز باقی تھی۔ اسے طبی امداد کے لیے ہسپتال لے گئے جہاں اس کی جان بچالی گئی۔ جب عدالت نے اسے موت کی سزا

سنائی تو وہ انقلابی شاعر کرستو یستف کا لکھا ہوا گیت الاپ رہی تھی۔ جیل میں اس کی ملاقات ایک اور انقلابی لڑکی راڈا سے ہوئی۔ دونوں مردانہ بھیس بدل کر بھاگ کھڑی ہوئیں اور گوریلوں کے دستوں میں شامل ہو کر جنگ میں کود گئیں۔ 1944ء میں جب بلغاریہ میں فاشتی حکومت کا خاتمہ ہوا تو سونیا کو پارٹی کی سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا۔ اس کی منظم کی ہوئی یہی پارٹی آج برسرِ اقتدار ہے۔

چین میں انقلابی خواتین نے درخشاں کارنامے سرانجام دیئے اور بڑھ چڑھ کر قربانیاں دیں۔ ماؤزے تنگ کی بیوی یانگ کوئی ہوئی اس کے بیٹے اور بہن کوتسی ہنگ کو گورنر ہوچین نے گرفتار کرلیا۔ گورنر نے یانگ (لغوی معنی شمشاد کا درخت) سے کہا کہ وہ ماؤزے تنگ سے اپنا نکاح ختم کردے۔ یانگ کے انکار پر اس کے باپ اور ماؤ کی بہن کوتسی ہنگ کو گولی ماردی گئی۔ لانگ مارچ میں چھتیس عورتیں شامل تھیں۔ جن میں ماؤزے تنگ کی دوسری بیوی ہوتسوچن کئی ماہ سے حاملہ تھی۔ ایک دن وہ دشمن کے ہوائی حملے کی زد میں آ گئی۔ بموں کے چھ ٹکڑے اس کے بدن میں پیوست ہو گئے لیکن وہ بچ نکلی اور اس کے بطن سے ماؤزے تنگ کا ایک بیٹا پیدا ہوا۔ مارچ کے دوران میں ماؤزے تنگ نے کہا کہ عورتیں مردوں سے زیادہ مستقل مزاج اور دلیر ثابت ہوئیں۔ ان میں مارشل چوتہہ کی چوتھی بیوی اس کی پہلی بیویاں یکے بعد دیگرے دشمن کے ہاتھوں قتل کی گئی تھیں؛ کانگ کے چن فوج کی بہادر ترین خاتون تھی۔ وہ ہمیشہ تین یا چار رائفلیں اٹھا کر چلتی تھی اور بعض اوقات کسی زخمی یا مریض سپاہی کو بھی اپنے کاندھوں پر اٹھا لیتی تھی۔ وہ بہترین نشانہ باز تھی۔ اس نے پہلی بار 1934ء کی ایک لڑائی میں ایک دستے کی قیادت کرتے ہوئے بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ جنرل ہولنگ کی جانباز بہن ایک جھڑپ میں گولیوں کی بوچھاڑ سے چھلنی ہو کر گری اور مسکراتے ہوئے دم توڑ دیا۔

شمالی کوریا اور ویت نام کی خون آشام جنگوں میں ہزاروں جوان لڑکیاں امریکی سامراج کے خلاف لڑتی ہوئی کھیت رہیں۔ انہوں نے دنیا کی سب سے طاقت ور سامراجی مملکت کو ذلت آمیز شکست دے کر تاریخ عالم کا ایک نیا باب اپنے جوان لہو سے رقم کیا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران نازی یلغار کا مقابلہ کرتے ہوئے دو کروڑ روسی جوان مارے گئے تھے۔ اس لیے آج وہاں عورتوں کی تعداد مردوں سے چار فی صد زائد ہے۔ عورتیں

تمام شعبوں میں مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں۔ 55 فیصد نظم ونسق کے اداروں سے وابستہ ہیں۔ استانیوں کا تناسب 71 فیصد ہے اور لیڈی ڈاکٹروں کا 86 فیصد۔ 60 فیصد عورتیں مختلف سائنسی اور تکنیکی شعبوں میں ماہرین کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ دنیا کی پہلی خلاباز خاتون روسی ہے۔ 36 ہزار خواتین نے سائنس کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ بلغاریہ کی دس فیصد خواتین وکیل' 38 فیصد اہل قلم اور 50 فیصد استاد ہیں۔ مالیغا پو پودا ملک میں کی مایہ ناز معیشت دان ہے' جسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ روس کا معروف دانش ور کولیا نوفسکی اپنی کتاب ''اشتراکی معاشرے میں عشق' شادی اور کنبہ'' [1] میں لکھتا ہے:

> ''ہمارے اشتراکی انقلاب نے عورت کو کامل آزادی دلائی ہے اور ہر پہلو سے اسے مردوں کے مساوی حقوق دیئے ہیں۔ شاندار سیاسی' معاشی اور سماجی کارنامے انجام دے کر عورتیں قلیل عرصے میں اشتمالی معاشرے کے معماروں میں شامل ہوگئی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی دین اتنی ہی گرانقدر ہے جتنی کہ مردوں کی سوویت روس میں عورتوں کے روایتی معاشرتی اور حیاتیاتی کمتری کے شاخسانے کو غلط ثابت کر دکھایا گیا ہے۔''

محنت کا نیا روپ:

انجلز نے کہا کہ محنت نے بن مانس کو انسان بنایا تھا۔ دوسرے حیوانات آج بھی خوراک حاصل کرنے کے لیے پنجوں' دانتوں اور چونچوں سے کام لے رہے ہیں۔ جب کہ انسان کے آباؤاجداد نے پتھروں اور لاٹھیوں سے اوزار بنائے اور ترقی کی جانب قدم بڑھایا جیسا کہ ہم نے پہلے باب میں دیکھا قدیم اشتمالی معاشرے میں قبیلے کے سب افراد مل کر کام کرتے تھے اور پیداوار میں اپنی ضرورت کے مطابق حصہ لیتے تھے۔ زرعی انقلاب کے بعد شخصی املاک نے معاشرے کو آقا اور غلام کے طبقات میں تقسیم کر دیا اور جبر و استحصال کا آغاز ہوا۔ غلام محنت کرتے تھے اور آقا بیٹھے بٹھائے ان کی گاڑھے پسینے کی کمائی بٹور لیتے تھے جس سے محنت جبری بیگار بن گئی۔ محنت کشوں کو نیچ اور کمینہ کہتے تھے اور طفیل

---

[1] Love Marriage and Family in Socialist Society

خوار ذی وقار اور معزز کہلاتے تھے۔ ہاتھ کی محنت جو کسی زمانے میں انسان کی سب سے بڑی ضرورت تھی اور جو انسان کی ذہنی نشوونما کا باعث ہوئی تھی۔ طبقاتی معاشرے میں ذلت ورسوائی کی علامت بن گئی جیسا کہ آج بھی ہم بورژوا معاشرے میں دیکھ رہے ہیں۔ طفیل خوار بورژوازی حکومت اور دولت پر قابض ہیں اور دولت پیدا کرنے والے فاقے کاٹنے پر مجبور ہیں۔

اشتراکی معاشرے میں محنت کی کھوئی ہوئی منزلت کو بحال کر دیا گیا ہے۔ وسائل پیداوار پر محنت کشوں کا اپنا قبضہ ہے۔ وہ امراء کو عیش وعشرت کے سامان فراہم کرنے کے لیے کام نہیں کرتے بلکہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے محنت کرتے ہیں۔ ان کی پیدا کی ہوئی زائد قدر منافع بن کر کارخانہ داروں کی تجوریوں میں نہیں جاتی بلکہ اجتماعی تمول میں اضافہ کرتی ہے۔ محنت کش کسی امیر طبقے کے لیے بیگار نہیں کاٹتے بلکہ پورے سماج کی بہبود کے لیے خوش دلی سے کام کرتے ہیں۔

بورژوا معاشرے میں محنت کش بے دلی سے کام کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی محنت کا ثمر بے کار کارخانہ داروں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ اشتراکی معاشرے میں شخصی مفادات، اجتماعی مفادات کے تحت ہوتے ہیں، جس سے محنت تخلیقی وتعمیری صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ احساس کہ وہ پورے معاشرے کی بہتری کے لیے کوشاں ہے۔ ایک مزدور یا کسان کی محنت کو مسرت آمیز فریضہ بنا دیتا ہے اور محنت تفریح بن جاتی ہے۔ وہ کام اس لیے کرتا ہے کہ کام کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔ اس پر یہ راز کھل گیا ہے کہ محنت وجہ معاش کا وسیلہ ہی نہیں ہے بلکہ زندگی ایک اہم ضرورت بھی ہے اور اس سے انسان کی بہترین ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ سائنسدان ہو یا کان کن، فن کار ہو یا بڑھئی وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں معاشرے کی بہبود کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ اس کی محنت نہ صرف ذاتی آسودگی کا باعث ہوتی ہے بلکہ عمومی مسرت میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ اشتراکی معاشرے میں جسمانی محنت اور ذہنی کاوش کا فرق بھی مٹ جاتا ہے۔ ایک کاریگر کل بناتے وقت وہی خوشی محسوس کرتا ہے جو ایک موسیقار کو نغمہ لکھتے وقت یا قصہ نویس کو کہانی لکھتے وقت میسر آتی ہے۔ بورژوا دانشور کہتے ہیں کہ اشتراکی معاشرے کے افراد جبر کا نشانہ بن گئے ہیں کہ اس میں ہر شخص کو کام کرنا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اشتراکی معاشرے کا

بنیادی اصول یہی ہے کہ ''جو کام نہیں کرے گا' نہیں کھائے گا'' لیکن اسے جبر نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ایک تو کام کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ دوسرے جب کام ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ عمومی مفاد کے لیے کیا جائے تو وہ جبر نہیں رہتا بلکہ خوشگوار فریضہ بن جاتا ہے۔ بورژوا معاشرے میں البتہ محنت کش جبر کا شکار ہو گئے ہیں کیونکہ وہ نان شبینہ کی خاطر طفیل خوار صنعت کاروں کی نفع اندوزی کے لیے کام کرنے پر مجبور ہیں۔

ترقی کا نیا ولولہ:

اشتراکی انقلاب نے عوام کو ترقی کے ولولے سے سرشار کر دیا ہے جب کہ بورژوازی اپنی ذہنی اور سماجی تنزل پذیری کے باعث یاسیت میں مبتلا ہو گئے ہیں اور کہنے لگے ہیں کہ ترقی محض واہمہ ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے جب کوئی تمدن اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے زوال کا آغاز بھی ہو جاتا ہے۔ اور یہ زوال پذیری تہذیب و تمدن کا مقدر بن چکی ہے۔ اس سے مفر کی کوئی بھی صورت ممکن نہیں ہے۔ اس نوع کے استدلال کا سیدھا سادھا جواب کافی ہے کہ اگر ترقی کا تصور واہمہ ہوتا تو انسان بھی دوسرے درندوں کی طرح بھٹوں اور کھوہوں میں گذر بسر کر رہا ہوتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اکثر قنوطی آسودہ حال اور دولت مند ہوتے ہیں۔ گوتم بدھ ایک شہزادہ تھا جسے دنیا جہان کی نعمتیں میسر تھیں۔ عمر خیام کو ''شرابے کبابے نگارے چنارے'' کے لوازم میسر تھے۔ ابوالعلاء معری اپنے علاقے کا رئیس تھا۔ شوپنہائر دولت مند آدمی تھا اور خوب صورت عورتوں کا رسیا تھا۔ ان کی یاسیت کا سبب یہی ہے کہ یہ لوگ دنیا جہان کی نعمتیں سمیٹ لیتے ہیں تو انہیں اپنی موت کا خیال ستانے لگتا ہے اور جب موت پر قابو نہیں پا سکتے تو لاڈلے بچے کی طرح منہ بسورنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زندگی بے ثمر اور بے مصرف ہے۔

آج کل بورژوا کو بھی یاسیت اور بے حاصلی کے عمیق احساس نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اس یاسیت کی جھلک قدرتاً ان کے ادب و فن میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ بات یہ ہے کہ سرمایہ دار اور ساہوکار اپنی عمر کا بہترین حصہ دولت کے انبار سمیٹنے میں گذار دیتے ہیں اور پچاس ساٹھ کی عمر کو پہنچ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ بڑھاپے اور موت کا کیا کیا جائے۔ آخر اس مجنونانہ دوڑ دھوپ کا مطلب کیا تھا۔ ہماری عمر تو رائیگاں ہی گئی۔ بے

معنویت کا یہ احساس ان کے ذہنی توازن کو درہم برہم کر دیتا ہے اور یہ لوگ نفسیاتی شفا خانوں کا رخ کرتے ہیں۔ تاریخ عالم کے سرسری مطالعے سے ہی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یاسیت کا دور ہمیشہ کسی قوم کے دورِ زوال سے وابستہ رہا ہے۔ معاصر بورژوا تہذیب و تمدن کی بھی یہی حالت ہے۔ سپنگلر، ٹوئن، بی سی. ایم جوڈ وغیرہ نے جدید مغربی تمدن کی زوال پذیری اور اس کے اسباب سے تفصیلی بحث کی ہے۔

اشتراکیوں کی رجائیت بورژوا دانشوروں کے لیے باعث تعجب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اشتراکی جو قدرتی اور معاشرتی قوانین کے جبر کے قائل ہیں اور مذہب و تصوف کے منکر ہیں۔ وہ رجائی کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ اس نکتے سے صرف نظر کر لیتے ہیں کہ اشتراکیوں نے جبر میں اختیار کو پا لیا ہے۔ ان کے خیال میں فطرتی قوانین کے جبر کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر کے ان سے حسب منشا کام لیا جا سکتا ہے اور جبر کا یہی شعور انسان کو اختیار سے بہرہ ور کر دیتا ہے۔ انسان ان قوانین کو بدل دینے سے قاصر ہے لیکن ان کے جبر کے دائرے میں رہ کر قدر و اختیار کو پا لیتا ہے۔ اس طرح تاریخی عمل اور معاشرہ انسان کے قوانین کو توڑنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے لیکن وہ ان کی حدود میں رہ کر اور جدوجہد کر کے اپنے لیے عادلانہ معاشرہ تعمیر کر سکتا ہے۔ اشتراکیوں کی رجائیت کا راز اسی بات میں مخفی ہے کہ ایک تو انہوں نے جبر میں اختیار کو پا کر بنی نوع انسان کو یاسیت کے گھور اندھیرے میں امید کی کرن دکھائی ہے اور دوسرے وہ ایک اعلیٰ نصب العین کے حصول میں کوشاں ہیں اور بڑے اعتماد سے اشتراکیت کے عبوری دور سے گذر کر اشتمالی معاشرے کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔

ماضی کی باقیات:

فرانس کے ایک اہل قلم آندرے مالرو نے چیئرمین سے ملاقات کے دوران پوچھا:[1]

"کیا چین میں آج بھی طاقت ور مخالفت موجود ہے؟"

ماؤزے تنگ: "ابھی ہمارے ہاں بورژوا وطن پرست اور دانش ور موجود ہیں اور ان کی اولاد معنوی سر اٹھانے لگی ہے۔"

---

1. Anti - Memoirs

دانشور: ''کیوں؟''

ماؤزے تنگ: ان دانشوروں کی فکر مارکس کی تعلیمات کے منافی ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران میں ہم نے خوش دلی سے انہیں اپنی صف میں شامل کیا تھا کیونکہ اس زمانے میں ہمارے ہاں دانش وروں کی کمی تھی اگرچہ ہم جانتے تھے کہ یہ لوگ کومن ٹانگ سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کے اثرات نوجوان نسل کے ذہن پر باقی ہیں۔''

لینن نے بھی انقلاب کے بعد کہا تھا کہ روس کے اشتراکی معاشرے میں گذشتہ بورژوا عہد کا طرزِ فکر و احساس کافی عرصے تک باقی رہے گا اور عوام خصوصاً دانشوروں کے ذہن و قلب سے اس کے اثرات کو زائل کرنا اشتراکی نظام کے لیے ایک مسئلہ بن جائے گا۔ ماؤزے تنگ نے بورژوا عہد کے اثرات کا انسداد کرنے کے لیے ہی اپنے ملک میں تہذیبی انقلاب کا آغاز کیا تھا۔ اشتراکی رہنماؤں کے لیے یہ مسئلہ خاصا مشکل ثابت ہوا ہے۔ لیکن وہ اس کے مضمرات کا پورا وقوف رکھتے ہیں۔ بورژوا طعن کرتے ہیں کہ اشتراکی انقلاب عوام کے ذہن و دماغ کو صرف سطح تک ہی متاثر کر سکا ہے اور ان کے رگ و پے میں نفوذ نہیں کر سکا۔

بات یہ ہے کہ پچاس ساٹھ برسوں کی قلیل مدت میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ دانشوروں کا وہ مزاج تھلی جس کے خمیر میں گذشتہ دس ہزار برسوں کی روایات رچ بس گئی تھیں چند سالوں میں بدل کر رکھ دیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ معاشی بنیاد یا وجود کے بدلنے کے ساتھ اور شخصی املاک کی جگہ مشترکہ املاک کا نظام رائج کر دینے سے اس کی بالائی عمارت یعنی سیاسی' معاشرتی اور ادبی قدریں بھی بدل گئی ہیں۔ لیکن بعض نوجوان طبائع کا سامراجیوں کے مسلسل اور گمراہ کن پراپیگنڈا سے اثر پذیر ہونا قدرتی امر ہے۔ اسی پراپیگنڈے سے متاثر اگر کچھ اشتراکی لوگ اپنے ملک سے بھاگ کر مغربی ممالک میں آ جاتے ہیں تو ان اکا دکا مثالوں سے اشتراکی طرزِ حیات کی ناکامی پر دلیل لانا تعصب بے جا ہوگا۔ اس کے مقابلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں لاکھوں افراد اشتراکیت کو قبول کر کے پرولتاریہ کی انقلابی جدوجہد میں جوق در جوق شامل ہو رہے ہیں۔ فرانس' پرتگال' اطالیہ' یونان' ہسپانیہ' ہند' ترکی ایران وغیرہ ممالک میں بڑی بڑی اشتراکی تنظیمیں کام کر رہی

ہیں۔ جن سے اشتراکیت کے رواج و قبول پر زیادہ محکم دلیل دلائی جا سکتی ہے۔ بورژوا دانش ور ایک ستم یہ بھی کرتے ہیں کہ وہ خود تو اپنے معاشرے کی عام خامیوں اور کوتاہیوں کا جواز "انفرادی آزادی" کے نام پر پیدا کر لیتے ہیں لیکن کسی اشتراکی مرد یا عورت سے کوتاہی ہو جائے تو سارے اشتراکی معاشرے کی ناکامی کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔

اس مسئلے کو تحقیقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شکار کے زمانے کی سبلی روایات صدیوں تک جاگیرداری معاشرے میں باقی رہی ہیں۔ لالچ اور حسد کی بناء پر کسی کو بے دریغ قتل کرنے' دوسروں کا مال چوری اڑا لے جانے' ڈاکہ ڈال کر لوٹ لینے' عورتوں کو زبردستی اٹھا کر لے بھاگنے کی روایات شکار کے عہد کی باقیات ہیں جو جاگیرداری معاشرے میں منظم جرائم کی صورت اختیار کر گئیں۔ ان جرائم کی تہہ میں شخصی املاک' زر' زمین' زن کی ہوس کارفرما تھی۔ شخصی املاک کے خاتمے سے اس نوع کے جرائم کا اشتراکی معاشرے میں انسداد کر دیا گیا ہے جب کہ بورژوا معاشرے میں جرائم بدستور زوروں پر ہیں۔ مقام غور ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی سامراجی اور سرمایہ دارانہ ریاست اضلاع متحدہ امریکہ میں دنیا بھر کی اقوام میں سب سے زیادہ قاتل اور مجرم موجود ہیں۔

اشتراکی معاشرے میں سائنس کے اصولوں کی بناء پر نئے معاشرے کی تعمیر کا کام جاری ہے۔ جدید سائنس کے اثر و نفوذ سے پہلے ہزاراوں برسوں تک بنی نوع انسان کے دل و دماغ پر جہالت اور اوہام کی تاریکیاں محیط رہیں اور وہ فطرتی مناظر کو ایسے دیوتاؤں کی کارفرمائی سمجھتے رہے۔ جنہیں خود ان کے تخیل نے خلق کیا تھا۔ قدیم زمانے کی جادو اور ٹمن مت کی رسوم آج بھی بورژوا اقوام میں ٹیلی پیتھی' ماوراحسی ادراک' [1] حاضرات ارواح [2] اور بلور بینی [3] کی صورت میں موجود ہیں۔ جب کہ اشتراکی ممالک میں ان کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اسی طرح بورژوا معاشرے میں سعد و نحس' علم نجوم' کیمیا گری' چشم بد' شگون اور فال گیری کے توہمات باقی ہیں اور اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ ان کے قائل ہیں۔ ہندوستان کے مکار سادھو اور یوگی مغربی ممالک میں "ہرے راما ہرے کرشنا" کی قسم کے پاکھنڈ سے لوگوں کو جھانسے دے کر لاکھوں روپے بٹور رہے ہیں۔ ان لوگوں نے کبھی کسی

---

1. Extra-Sensory Perception
2. Smritualism.
3. Crystal Gazing

اشتراکی ملک کا رخ نہیں کیا کیونکہ وہاں ان کا توہم فروشی کا کاروبار پنپ نہیں سکتا۔ اشتراکی ممالک سے ہر نوع کے توہمات دیکھتے ہی دیکھتے یوں غائب ہو گئے ہیں جیسے سورج کی تمازت سے اوس کے قطرے فنا ہو جاتے ہیں۔

اشتراکی معاشرے کا نظم و ضبط بعض نوجوانوں خصوصاً ادیبوں اور شاعروں کو ناگوار گذرتا ہے اور وہ اہل مغرب کی بے راہ روی کو حقیقی آزادی سمجھ کر دھوکہ کھا جاتے ہیں اور تہذیب مغرب کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ جب تک سرمایہ دار اور سامراجی ممالک اشتراکی اقوام کا حلقہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کے پروپیگنڈے کے اثرات سے کلی طور پر محفوظ رہ سکنا خوش فہمی ہوگی۔ اشتراکی دانشوروں کو اس حقیقت کا احساس ہے اور وہ اس صورت حالات سے نبٹنے کے لیے مارکسی تعلیمات کی روشنی میں نئے نئے حالات کے ساتھ ذہنی و عملی مطابقت پیدا کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

اشتراکیت اور سامراج

فرانس کا انقلاب بورژوا نے جاگیرداروں کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے برپا کیا تھا تاکہ وہ سیاسی اقتدار حاصل کر کے اپنے معاشی مفادات کی پرورش کر سکیں۔ عوام کی حالت بدستور زار و زبوں رہی کیونکہ جیسا کہ کارل مارکس نے کہا ہے محنت کش عوام کی حالت اس وقت تک بہتر نہیں ہو سکتی جب تک وہ خود وسائل پیداوار پر قبضہ کر کے استحصال کا خاتمہ نہ کر دیں۔ انقلاب کے بارے میں مارکس لکھتا ہے:

> ''انقلاب ضروری ہے کیونکہ ایک تو غاصب طبقے کو اس کے سوا کسی اور وسیلے سے ہٹایا ہی نہیں جا سکتا۔ دوسرے انقلاب کے دوران میں پرولتاریہ اپنے آپ کو پرانے معاشرے کی گھن سے پاک کر کے نئے معاشرے کی تعمیر کر سکتی ہے۔''

انقلابی صورت احوال کی تین شرائط ہیں:

1۔ عوامی غربت اور بدحالی 2۔ عوام کا بڑھتا ہوا سیاسی شعور 3۔ مقتدر طبقے کا بحران جو ان کے قصر اقتدار کو متزلزل کر دیتا ہے۔

پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں زار شاہی روس میں یہ تینوں شرائط پوری ہو گئیں۔ روس کے عوام پہلے ہی فاقہ زدہ تھے۔ جنگ نے ان کی حالت مزید ابتر کر دی۔ لینن اور اس کے ساتھیوں نے عوام میں شعور کی جوت جگائی۔ میدان جنگ میں جرمنوں کے ہاتھوں تابڑ توڑ شکستیں کھانے سے مقتدر طبقے کا وقار خاک میں مل گیا۔ ہزاروں سپاہی میدان جنگ کو چھوڑ کر اپنے گھروں کو آنے لگے اور ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ اتحادی

روس کو جنگ میں شامل رکھنا چاہتے تھے لیکن اشتراکی اسے سامراجیوں کی لڑائی سمجھ کر اس سے کنارہ کشی کو دعوت دیتے تھے۔ جرمنی نے لینن کو روس میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ 25 اکتوبر 1918ء کی شام کو بحری جہاز آروا نے گولہ داغ کر سرمائی محل پر ہلّہ بولنے کا اشارہ کر دیا۔ انقلاب کی کامیابی نے زار شاہی نظام کو زیروزبر کر دیا اور وہ ساعتِ سعید آن پہنچی جس کے انتظار میں ذلتوں کے مارے ہوئے کسان' مزدور اور غلام چشم براہ تھے۔ عبوری حکومت کا سربراہ کرنسکی پیٹروگراڈ میں امریکی سفارت خانے کی گاڑی میں بھاگ نکلا اور شمالی محاذ کے ایک مقام پسکون سے جنرل کرسنوف کی قیادت میں کاسکوں کی فوج دارالحکومت پر دھاوا بولنے کے لیے روانہ ہوئی۔ اس طرح اشتراکی حکومت کے خلاف مسلح حملے کا آغاز ہوا اور ملک میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھی۔

اہلِ مغرب نے اشتراکی حکومت کو کچلنے کے لیے ایکا کر لیا۔ اضلاع متحدہ امریکہ اور انگلستان کے فوجی دستے لوامانسک میں بحری جہازوں سے اترے۔ انگریزوں اور جاپانیوں نے ولاڈی واسٹک پر قبضہ کر لیا۔ سفید روسی زار اور جاگیرداروں کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ردِّ انقلاب کی کوشش میں وولگا میں شورش برپا کر دی اور سائبیریا اور یورال کے وسیع علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے جنوبی ایشیائی علاقے اور قفقاز پر فوج کشی کی۔ جرمنوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بالٹو روس اور یوکرین پر حملہ کر دیا اور ڈان کے علاقے میں گھس گئے۔ مغربی طاقتیں اشتراکی حکومت کو شکست دے کر ملک کو دوبارہ زار شاہی گماشتوں اور جاگیرداروں کی تحویل میں دینا چاہتی تھیں۔ ملکی زمینداروں نے حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ امریکیوں نے سفید روسیوں کو کروڑوں ڈالر کا جدید ترین اسلحہ فراہم کیا اور امریکی ساہوکاروں اور اجارہ داروں نے بڑھ چڑھ کر باغیوں کو مالی امداد دی اور کہا کہ نوزائیدہ اشتراکی مملکت کا خاتمہ کر کے دم لیں گے۔ ونسٹن چرچل نے ڈنکے کی چوٹ پر کہا کہ اشتراکیت کے شجرِ خبیث کو جڑوں سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ بالشویکوں نے تین برس کی خونریز جدوجہد کے بعد ردِّ انقلاب کی ان تمام کوششوں اور منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ لینن نے سچ کہا تھا:

"فتح ان کی ہوگی جن کا استحصال ہوتا رہا ہے کیونکہ ان کے ساتھ حیات ہے' تعداد کی کثرت ہے' عوام کی طاقت ہے' بے نفسی ہے' ایثار ہے'

دیانت کے مسلسل بہتے ہوئے سرچشمے ہیں' آگے بڑھنے' بیداری اور تعمیر نو کا جذبہ ہے' قوت کے ذخیرے ہیں' قابلیت ہے جو کسانوں اور مزدوروں میں خفی صورت میں موجود ہوتی ہے۔ فتح انہی کی ہوگی۔"

اشتراکی انقلاب سے سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں لرز گئیں۔ صنعتکاروں' اجارہ داروں اور ساہوکاروں پر جو ڈیڑھ صدی سے دنیا کی دولت لوٹ کھسوٹ کر ارب پتی بن گئے تھے سکتہ پڑ گیا۔ انہیں اس بات کا غم ستانے لگا کہ روس کا انقلاب کامیاب ہو گیا تو ان کا صنعتی اور تجارتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لیے جب وہ سوویت روس کا خاتمہ کرنے میں ناکام رہے تو انہوں نے اشتراکیت کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے نئے نئے حربے آزمانا شروع کیے۔ سرمایہ دارانہ نظام کو دوسرا بڑا دھچکا اس وقت لگا جب یکم اکتوبر 1949ء کے چینی اشتراکی انقلاب کا اعلان ہوا۔ چینی انقلاب کو روکنے کے لیے بھی امریکی حکومت نے سات ارب ڈالر کا جدید ترین اسلحہ' چیانگ کیشنک کو فراہم کیا اور اس کی امداد کے لیے اپنے جرنیل اور ہوا باز بھیجے لیکن فتح انہی کی ہوئی جن کے ساتھ بالفاظ لینن "حیات" تھی۔ مغرب کے سامراجی اجارہ داروں کو اس بات کا بھی شدید صدمہ تھا کہ اشتراکی انقلاب کے بعد روس اور چین جیسی وسیع منڈیاں ان کے قبضے سے نکل گئیں کیونکہ اشتراکیوں نے پہلا اقدام یہ کیا کہ فولاد کی بھاری صنعت قائم کر کے اہل مغرب کے تکنیکی اجارہ کا خاتمہ کر دیا اور اپنی کلیں خود بنانے لگے۔

کارل مارکس کی یہ پیشگوئی سچی ثابت ہوئی کہ داخلی تضادات کے باعث باقاعدہ وقفوں کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کو شدید مالی بحرانوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ 1929ء میں اس نوع کا ہمہ گیر بحران رونما ہوا۔ جس نے سرمایہ دار دنیا کو شدید مشکلات سے دوچار کر دیا۔ کساد بازاری کے باعث سینکڑوں کارخانے بند ہو گئے اور لاکھوں مزدور بے روزگار ہو گئے۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ پہلی عالم گیر جنگ کے دوران میں صنعت و حرفت کو بے پایاں وسعت ہوئی تھی۔ جس کے باعث منڈیاں مصنوعات سے بھر گئیں اور ان کی قیمتیں یک لخت گر گئیں۔ اس بحران کے دوران یورپ کے ممالک میں فاشتی رجحان پیدا ہوا۔ وطنیت اور عوامی بہبود کے نام پر مسولینی اور ہٹلر جیسے طالع آزماؤں نے جرمنی اور اطالیہ کی حکومتوں پر قبضہ کر لیا اور بڑے بڑے کارخانہ داروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ انہوں نے اپنی فوجوں کو

کیل کانٹے سے لیس کیا اور اتحادیوں سے گذشتہ شکست کا بدلہ لینے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس ہنگامہ آرائی کا اصل سبب یہ تھا کہ جرمنی' اطالیہ اور جاپان' ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کی منڈیوں میں حصہ بٹانا چاہتے تھے۔ ہٹلر نے اپنے ہمسایہ ممالک پر تاخت کر کے دوسری جنگ عظیم کا آغاز کیا۔ یہ جنگ بھی درحقیقت پہلی عالم گیر جنگ کی طرح لٹیروں کی باہمی چشمک اور مسابقت کا نتیجہ تھی۔ فرانس اور انگلستان کی فوجیں نازیوں کی یلغار کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ سوویت روس نے اس جنگ سے پہلو بچانے کے لیے ہٹلر کے ساتھ معاہدہ بھی کیا لیکن ہٹلر کو یوکرین کے زرخیز علاقے اور سوویت تیل کی ضرورت تھی۔ اس لیے اس نے اچانک روس پر حملہ کر دیا۔ اشتراکی سپاہی اپنی روایتی شجاعت کے ساتھ جی توڑ کر لڑے اور ماسکو اور سٹالن گراڈ کے محاذوں پر نازیوں کی بہترین فوجوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ جب روس میں نازی فوجی طاقت کو کچل دیا گیا تو مغرب کے کاغذی شیروں نے نارمنڈی کا محاذ کھول کر فتح کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کی۔ نازی حملہ آوروں کو شکست دے کر روسیوں نے اشتراکی نظام معاشرہ کے استحکام اور ثبات کا درخشاں ثبوت دیا۔ سٹالن کی آمریت اور اس کی ''شخصیت کے مسلک'' پر کڑی تنقید کی گئی ہے جو بڑی حد تک بجا ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے دنیا کو فاشستی خطرے سے نجات دلائی تھی۔

دوسری عالمگیر جنگ کے نتائج بڑے گہرے اور دور رس ہوئے۔

1- مشرقی یورپ کے ممالک پولینڈ' ہنگری' مشرقی جرمنی' آسڑیا' رومانیہ' چیکو سلواکیہ' یوگوسلاویہ' بلغاریہ اور البانیہ میں اشتراکیت کا نفاذ عمل میں آیا۔

2- پرانی سامراجی طاقتوں فرانس اور انگلستان کو زوال آ گیا۔ ایشیا اور افریقہ کے پچاس سے زیادہ ممالک یورپی سامراج کی گرفت سے آزاد ہو گئے۔

3- دنیا تین قسم کی ریاستوں میں بٹ گئی۔

1- سرمایہ دار ترقی یافتہ ریاستیں 2- اشتراکی ترقی یافتہ ریاستیں 3- نو آزاد ترقی پذیر ریاستیں' جنھیں تیسری دنیا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس جنگ کے خاتمے پر اضلاع متحدہ امریکہ دنیا کی سب سے طاقتور سرمایہ دار اور سامراجی ریاست بن کر ابھرا۔ اس کے پیش نظر چند واضح مقاصد تھے۔

1- سرمایہ دارانہ نظام کی حفظ و بقا۔

2- اشتراکی ممالک کے خلاف محاذ آرائی اور فوجی اڈوں کی تعمیر سے ان کا گھیراؤ۔

3- نوآزاد ترقی پذیر ریاستوں پر معاشی اور سامراجی تسلط۔

4- مغربی یورپ میں اشتراکیت کے نفوذ کی روک تھام۔

مغربی یورپ کے ممالک خاص طور سے فرانس' اطالیہ اور مغربی جرمنی میں معاشی بدحالی کے باعث اشتراکی انقلاب کے آثار پیدا ہوگئے تو اضلاع متحدہ نے مارشل ایڈ کے نام سے انہیں کروڑوں ڈالر کی امداد دے کر ان کی معیشت کو سنبھالا دیا۔ روس اور چین میں اشتراکی انقلاب کی کامیابی نے افریقہ' ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں ہلچل پیدا کی اور مارکس' لینن اور ماؤ کے افکار کی اشاعت زور شور سے ہونے لگی۔ یہ صورتِ احوال اضلاع متحدہ امریکہ کے لیے بڑی اندیشہ ناک تھی۔

امریکہ کے ارب پتی اجارہ داروں اور ساہوکاروں کو بخوبی معلوم تھا کہ نوآزاد ملکوں میں اشتراکی نظام کا نفاذ ہوگیا تو ان کا ساری دنیا کو اپنی منڈی بنا لینے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ ان ممالک کو اپنے حلقہ اقتدار و استحصال میں رکھنے کے لیے انہیں قرضے دینے کا آغاز ہوا جس کا مقصد دوگونہ تھا۔

1- ان اقوام کی قوتِ خرید کو بحال کرنا تاکہ وہ امریکی مصنوعات خرید سکیں۔

2- انہیں اشتراکیت کے نفوذ سے بچانا۔

یہیں سے نئے نوآبادیاتی نظام [1] اور سرمایہ دارانہ اجارہ داری کی شروعات ہوئی۔ اضلاع متحدہ نے نوآزاد ریاستوں کو جنہوں نے سامراجیوں کی پہنائی ہوئی آہنی زنجیروں کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا تھا۔ نئے سرے سے سونے چاندی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اس اقتصادی تسلط کو بحال رکھنے اور تقویت دینے کے لیے تین محاذ کھولے گئے۔

1- اقتصادی 2- سیاسی 3- نظریاتی

دوسری جنگ عالم گیر کے بعد اضلاع متحدہ امریکہ میں ریاستی اجارہ داری نے واضح شکل و صورت اختیار کر لی یعنی سرمایہ داری کے ساتھ ریاست کی طاقت بھی شامل ہوگئی۔ نوآزاد ملکوں میں اضلاع متحدہ نے امداد اور قرضوں کے نام پر ستر ہزار ملین ڈالر کی

1- Neococonialism

سرمایہ کاری کر رکھی ہے جس کے تحفظ کے لیے ہر نوع کے سامراجی اور سیاسی ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں اشتراکیت کے رواج و قبول سے امریکی اجارہ داروں کا سرمایہ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ وہاں امریکی حکومت رسوائے زمانہ سی آئی اے کی مدد سے ترقی پسند اور خوش خیال ملکی سیاستدانوں کو اپنی راہ سے ہٹا دیتی ہے۔ 17/ اپریل 1961ء میں امریکی حکومت نے سی آئی اے سے مل کر کیوبا پر حملہ کروایا۔ جس کی ناکامی کی ذمہ داری بعد میں صدر کینیڈی نے اپنے سر لے لی۔ اسی طرح کانگو میں لومبا' الجیریا میں بن بیلا' انڈونیشیا میں سوئیکارنو اور چلی میں الاندے کو امریکی سامراجیوں نے معزول یا قتل کروادیا تھا۔

1951ء میں اضلاع متحدہ امریکہ میں ایک ہزار اجارہ داریاں تھیں۔ 1959ء میں ان میں سے اکثر 138 بڑی بڑی اجارہ داریوں میں ضم ہو گئیں۔ 1961ء میں پانچ سو عظیم ترین صنعتی اداروں اور پچاس بڑی بڑی صنعتی فرموں نے 37386 دوسری کمپنیوں کو ہڑپ کر لیا۔ صنعتی سرمائے کا بیشتر حصہ پچیس بنکوں کے تصرف میں آچکا ہے۔ برطانیہ میں بیس' فرانس میں دس اور جاپان میں آٹھ بنکوں نے ملکی سرمائے کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس طرح گنتی کے چند پدم پتی صنعت و حرفت تجارت اور ساہوکارے کے اجارہ دار بن بیٹھے ہیں اور ان کی پشت پر سرمایہ دار ریاستوں کی جنگی قوت موجود ہے۔ اضلاع متحدہ میں ایک سو اجارہ دار امریکہ کے کل صنعتی منافع کا پچیس فیصد حصہ بٹور رہے ہیں۔ ان کی ہوس زر روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور وہ دنیا بھر کی اقوام کو اپنا اقتصادی غلام بنا لینا چاہتے ہیں اقوام متحدہ کی شماریات کے مطابق 57-1953ء کے سالوں میں تیسری دنیا کے ممالک کو مصنوعات کے عوض خام مال دے کر 13,400 ملین کا خسارہ ہوا یعنی 2200 ملین ڈالر سالانہ۔ اس سے صنعتی ممالک کے معاشی و تجارتی استحصال کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس منافع میں اضلاع متحدہ کا حصہ 25% اور برطانیہ کا دس فیصد ہے۔ 1950ء اور 1966ء کے درمیانی سالوں میں دوسرے ممالک میں اضلاع متحدہ کی سرمایہ کاری میں 40,000 ملین ڈالر اور صرف ترقی پذیر ملکوں میں ستر ہزار ملین ڈالر کا اضافہ ہوا۔ ترقی پذیر ممالک فی الوقت اپنے قرضوں کا دس ہزار ملین سالانہ سے زیادہ کا سود ادا کر رہے ہیں۔ ہر سال محض سود ادا کرنے کے لیے انہیں کروڑوں ڈالر کے نئے قرضے لینا پڑتے ہیں۔ اس چکر میں

آ کر ان کی معیشت تباہ ہو رہی ہے اور اربوں ڈالر کے قرضے لینے کے باوجود معیار زیست روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کی قوت پیداوار میں 65-1960ء کے سالوں میں 292 ڈالر فی کس کا اضافہ ہوا جب کہ ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ میں 12 ڈالر فی کس کا اضافہ ہو رہا ہے۔

گذشتہ ساٹھ برسوں سے یورپ اور اضلاع متحدہ کی اسلحہ سازی کی صنعت سب سے بڑھ کر منافع بخش ثابت ہو رہی ہے۔ گذشتہ عالم گیر جنگ میں سوویت روس کے سینکڑوں شہر' قصبات' دیہات اور صنعتی ادارے برباد ہو کر ملبے کے ڈھیر بن گئے اور دو کروڑ جوان کام آئے۔ جب کہ اضلاع متحدہ امریکہ نے اس جنگ میں ستاسی ارب ڈالر کمائے اور ان کے اتنے ہی سپاہی مارے گئے تھے جتنے کہ عموماً ہر سال سڑکوں کے حادثات میں مرتے ہیں اور اس کی سرزمین پر ایک بھی بم نہیں گرایا گیا۔ جنگ کے خاتمے پر امریکہ کی اسلحہ سازی کی صنعت شدید بحران کا شکار ہوگئی اور ہزاروں مزدور اور کاریگر بے کار ہو گئے۔ اپنی گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالا دینے کے لیے اضلاع متحدہ نے کوریا اور پھر ویت نام میں جنگ کی آگ بھڑکا دی۔ ان لڑائیوں میں اسے ذلت آمیز شکستوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کا اصل مقصد پورا ہو گیا۔ امریکی اسلحہ ساز ان تیس برسوں میں دونوں ہاتھوں سے روپے سمیٹتے رہے۔ ظاہراً امریکی اجارہ داروں اور اسلحہ سازوں نے جنگ کو ایک وسیع کاروبار بنا لیا ہے۔ جنگ ختم ہوتی ہے تو فلم سازوں کی باری آتی ہے اور وہ جنگی موضوعات پر فلمیں بنا بنا کر کمائی کرنے لگتے ہیں۔ امریکی اجارہ دار بظاہر "فرد کی آزاد اور اخلاقی قدروں کے تحفظ" کے نام پر جنگ چھیڑتے ہیں لیکن ان کا اصل مقصد اپنے کاروبار کو مزید وسعت دینا ہی ہوتا ہے۔ امریکہ کا ایک صحافی فرید کک اپنی کتاب [1] میں لکھتا ہے:

> "ایک ایسے ملک کا تصور ابھرتا ہے جس کی معاشی بہبود جنگ کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے۔ ہماری معیشت اور ہمارے خاندان کی بقا کا انحصار ان اسامیوں پر ہے جو اسلحہ سازی کی دوڑ کے ساتھ مربوط ہیں۔"

آج کل پدم پتی اسلحہ سازوں کے گماشتے دانش ور کہہ رہے ہیں کہ اگلی عالمگیر جنگ میں سرمایہ دارانہ نظام کا ایک خوفناک مالی بحران بالکل رفع ہو جائے گا۔ یہ لوگ

1. The Warfare State

اشتراکیت کا خطرہ کھڑا کر کے مجنونانہ اسلحہ سازی کا جواز پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایٹمی جنگ ناگزیر ہے۔ اسے کسی بھی صورت میں ٹالا نہیں جا سکتا۔ یہ تاریخ کا تقاضا ہے۔ ایک جرمن دانشور ولیم شلام کہتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کو ایٹمی جنگ ہی کامل تباہی سے بچا سکتی ہے۔ اس کا ایک ہم نوا جرمن کاہن برملا کہہ رہا ہے کہ اشتراکی ممالک کو ہائیڈروجن بم سے اڑا دینے ہی میں مغربی تہذیب و تمدن کی بقا کا راز مخفی ہے۔ کیونکہ پرامن طریقوں سے اشتراکیت کے رواج و قبول کو روکا نہیں جا سکتا۔ جرمن موجودی فلسفی کارل جاسپرز کے خیال میں اشتمالیوں کی عالم گیر فتح سے کہیں بہتر ہوگا کہ کرۂ ارض پر زندگی کا ہی خاتمہ کر دیا جائے کیونکہ اشتراکیت ''مسیحی قدروں کی نفی کر رہی ہے۔'' ''سرخا ہونے سے مر جانا بہتر ہے۔'' اس قبیل کے دانش وروں کا نعرہ بن گیا ہے۔ سوویت روس کی حکمت عملی یہ ہے کہ ایٹمی جنگ میں بنی نوع انسان صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اس لیے مستقل امن و امان کا قیام ضروری ہے جب کہ امریکی دانشور امن و امان کو سینکڑوں ہائیڈروجن بموں سے زیادہ ہلاکت آفریں تصور کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مستقل اور پائیدار امن کی صورت میں ان کی اسلحہ سازی کی صنعت تباہ ہو جائے گی اور ان کا معاشرہ جو ایک عرصے سے زوال پذیر ہے گل سڑ کر تباہ ہو جائے گا۔ ان کے یہ خدشات بڑی حد تک درست ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ دنیا بھر کے رجعت پسند امن سے خائف ہیں۔ ایک جرمن مصنف ڈبلیو ایس شلیمان لکھتا ہے:[1]

> ''اشتمالیت امن و امان کے حالات میں پھلتی پھولتی ہے۔ اس لیے مغرب کو جنگ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

''امن کا بم'' یورپ اور اضلاع متحدہ کے لیے سینکڑوں ہائیڈروجن بموں سے زیادہ مہلک ہے۔ ان ممالک میں آئے دن زبردست ہڑتالیں کی جاتی ہیں۔ لاکھوں مزدور بے روزگاری کے عالم میں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے اور قتل و غارت روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک امریکی شہر میں بجلی کی رو چند گھنٹوں کے لیے ٹوٹ گئی تو اس ''رفاہی مملکت'' کے آسودہ حال شہریوں نے رات کے گھور اندھیرے میں بڑی بڑی دوکانوں پر دھاوا بول دیا اور کروڑوں ڈالر کا سامان لوٹ کر

1. Germany and the East West Criss

لے گئے۔ سینکڑوں نوخیز لڑکیوں اور بیاہتا عورتوں کو دبوچ لیا گیا اور ان کی چادر عصمت تار تار کر دی گئی۔ اس شرمناک واقعہ نے دنیا کی سب سے بڑی سامراجی ریاست کی ذہنی پستی' مجرمانہ ذہنیت اور اخلاقی کجروی کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے۔ اس کے برعکس تاشقند کے شہر کو پے در پے زلزلوں نے زمین بوس کر دیا تو سوویت روس کے دور دراز علاقوں سے ہزاروں رضا کار کاریگر ہجوم کر آئے اور دن رات محنت کر کے اسے از سر نو تعمیر کر دیا۔

بے روزگاری کے ساتھ ساتھ افراط زر اور مہنگائی بورژوا معاشرے کا معمول بن چکی ہے۔ ڈالر کی قیمت گر چکی ہے اسے بحال کرنے کے لیے فرانک مارک اور ین کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک بھی ڈالر سے نجات پانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ اضلاع متحدہ اور یورپ کی صنعتی پیداوار اپنے ہی ہم وطنوں میں تقسیم کرنے کی بجائے منافع خوری کے لیے دوسرے ممالک کو برآمد کر دی جاتی ہے جس سے بھوک اور افلاس کا تضاد شدت اختیار کر گیا ہے۔ اضلاع متحدہ جو بظاہر خوش حال دکھائی دیتا ہے' جاں گسل سماجی' اخلاقی اور معاشی بحرانوں میں مبتلا ہے۔ دنیا کے اس امیر ترین ملک میں تین کروڑ سے زائد باشندے معاشی بدحالی میں مبتلا ہیں۔ 1960ء میں صدر کینیڈی [1] نے کہا تھا کہ امریکہ میں دو کروڑ سے زائد باشندے فاقہ کشی کر رہے ہیں اور گندے نواح میں رہتے ہیں۔ آج کل ان محتاجوں کی تعداد بڑھ کر تین کروڑ ستر لاکھ ہو گئی ہے۔

سامراج کی تعریف کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں کہا گیا ہے کہ کسی ملک کا اپنی حدود سے باہر کسی دوسرے ملک پر سیاسی غلبہ اور اقتصادی تسلط قائم کرنے کا نام سامراج ہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے صنعتی انقلاب کے بعد جب تک فاضل صنعتی پیداوار امراء کی عیاشی کے سامان میں تبدیل ہوتی سامراجی عزائم پیدا نہیں ہوئے لیکن جب ایک ہی ملک میں فاضل پیداوار کی حد سے زیادہ فراوانی ہو گئی تو اسے برآمد کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی اور اسے دوسرے ملکوں پر بجبر و اکرہ ٹھونسنے سے سامراج وجود میں آیا۔ بورژوا کو یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ اس پیداوار کو اپنے ہی عوام میں بانٹ کر ان کے معیار معیشت کو بلند کیا جائے۔ وہ عوامی بہبود کی بجائے شخصی مفاد پرستی کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ امریکی مصنف ول ڈیوراں نے اپنے ہم وطنوں کو اس بارے میں مشورہ دیتے ہوئے لکھا ہے: [2]

---

1. New York Times 18 April 1960
2. Mansions of Philosophy

"ہمارے لیے اس سے اچھی بات اور کون سی ہو سکتی ہے کہ ہمارے تاجر اپنے ہی ملک کی منڈیوں میں اپنا مال بیچیں جبھی ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ ہمارے حصول مسرت کے لیے غیر ملکی منڈیوں پر قبضہ کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ صنعت و حرفت اور ایجاد و اختراع کے برکات کو اپنے عوام تک پہنچانا لازم ہے۔ ہمارے ملک کی کثیر آبادی ایک بہت بڑی منڈی ثابت ہو سکتی ہے۔"

یہ دل ڈیوراں کو خوش فہمی ہے۔ ہوس مال و زر انسان کے خیر سگالی اور ہمدردیٔ انسانی کے جذبات ہی کو کچل کر نہیں رکھ دیتی بلکہ اس کی حقیقت پسندانہ سوچ کو بھی سلب کر لیتی ہے۔ اضلاع متحدہ امریکہ اور یورپ کے اجارہ داروں کا لالچ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ آج کل وہ اپنے بے روزگار ہم وطنوں کو معقول اجرت دے کر ان کی روزی کا سامان کرنے کی بجائے ایشیا اور افریقہ کے مزدور اور کاریگر درآمد کر رہے ہیں کیونکہ وہ بہت ہی کم اجرت پر کام کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں مزدوروں سے جان چھڑانے کے لیے کمپیوٹر کی مدد سے خودکار کلیں بنائی جا رہی ہیں۔ پسماندہ ممالک کے استحصال کا ایک نیا طریقہ یہ رائج ہوا ہے کہ وہاں کے تربیت یافتہ ڈاکٹروں' انجینئروں اور تکنیکی ماہرین کو ترقی یافتہ ممالک روزگار فراہم کر رہے ہیں۔ جس سے پسماندہ ممالک کی صنعتی اور معاشی ترقی پر ناگوار اثر پڑا ہے۔

نئے نوآبادیاتی نظام کا ایک شرمناک پہلو یہ ہے کہ ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکی سرمایہ دار' زمیندار اور سیاسی مہم باز سامراجیوں کے گماشتے بن گئے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ان کی بقا سامراجیوں ہی کی بقاء سے وابستہ ہے۔ یہ گماشتے سرمایہ دار شخصی منافع پر وطن و ملت کے اجتماعی مفادات کو قربان کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے اور کروڑوں ڈالر کے بیرونی قرضوں کو نوکر شاہی اور سیاستدانوں کے ساتھ مل کر غصب کر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کا بال بال قرضے میں جکڑا گیا ہے۔ عوام کو ان قرضوں کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا۔ قرضوں کی رقوم میں اضافے کے ساتھ ساتھ عوام کی بدحالی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ قرضوں کی بھاری رقمیں سامراجیوں کے گماشتے سرمایہ دار' نوکر شاہی اور بددیانت سیاستدان بالا بالا اڑا لیتے ہیں اور ان کی ادائیگی کا بوجھ عوام کی کمر

توڑ رہا ہے۔

مارکس نے کہا تھا کسی ملک کی سیاسیات' اخلاقیات وغیرہ اس کے معاشی نظام ہی سے متفرع ہوتی ہے۔ اضلاع متحدہ امریکہ کی سیاسی حکمت عملی اس کے معاشی تقاضوں ہی سے صورت پذیر ہوئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی سیاسیات کی باگ ڈور بڑے بڑے اجارہ داروں یا ان کے نمائندوں کے ہاتھوں میں ہے جو دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں جنگ کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں تاکہ اپنا اسلحہ اور سامان حرب مہنگے داموں بیچ سکیں۔ ان کے گماشتے سفیروں اور اقتصادی مشیروں کی شکل میں ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کی اقوام میں نفرت اور کشیدگی کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ جس سے وہ آمادہ پیکار ہو جاتی ہیں اور فریقین امریکہ سے اسلحہ خریدنے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دیتے ہیں۔ اسرائیل کے قیام کا بھی مقصد تھا۔ اسرائیل کا خنجر عرب دنیا کے سینے میں گھونپ دیا گیا ہے اور مشرق وسطےٰ میں مستقل محاذ آرائی کی فضا پیدا کر دی گئی ہے۔ سامراجی سرمایہ دار ہر سال جو کھربوں ڈالر عرب شیوخ کو مٹی کے تیل کی خریداری کے لیے ادا کرتے ہیں۔ وہ ان کے ہاتھ مہنگے داموں اسلحہ بیچ کر واپس بٹور لیتے ہیں۔ کوریا اور تائیوان' رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ میں بھی صورت حال موجود ہے۔ امریکی اسلحہ ساز اپنے وسیع ذرائع ابلاغ سے اشتراکیت کا ہوا کھڑے کر کے اپنے کاروبار کو فروغ دے رہے ہیں۔ ہر سال پرانا اور فرسودہ اسلحہ مشرقی ممالک کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے۔ ایٹمی صنعت بھی اکثر و بیشتر اسلحہ سازوں کے تصرف میں ہے اور وہ سرد جنگ کے نام پر نئے نئے میزائل اور جوہری بم بنا رہے ہیں۔ سوویت روس کی عسکری طاقت ان کے راستے میں مزاحم نہ ہوتی تو امریکی اجارہ دار ساری دنیا کو اپنی منڈی بنانے میں کامیاب ہو جاتے۔ سوویت روس اور دوسرے اشتراکی ممالک ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کی اقوام کو نرم شرطوں پر قرضے اور مالی امداد دے رہے ہیں۔ اور مالی اور صنعتی خود کفالت پیدا کرنے کے لیے ان ممالک میں فولاد اور بجلی کی بھاری صنعتیں لگا رہے ہیں جس سے ہر کہیں اشتراکی انقلاب کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ اضلاع متحدہ امریکہ کی مضطربانہ تگ و دو کے باوجود پس ماندہ ممالک میں اشتراکیت کا نفوذ ہو رہا ہے۔ کیوبا کی اشتراکی ریاست اضلاع متحدہ کے لیے بلائے جان بن گئی ہے۔ اس کے واسطے سے چلی گوئٹے مالا' پانامہ اور بولیویا میں انقلابی جدوجہد کی جا رہی ہے۔ افریقہ میں

روڈیشیا' انگولا' کانگو' زمبیا' حبشہ وغیرہ کے عوام میں بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے۔ مشرقی ایشیا کے ممالک برما' ویت نام' لاؤس میں اشتراکیوں کا غلبہ ہے۔ ایران میں تودہ پارٹی اور شام میں بعث پارٹی عوام کی امنگوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ فی الوقت چودہ اشتراکی ریاستیں موجود ہیں جو کہ دنیا کی کل آبادی کی ایک تہائی پر مشتمل ہیں۔ تیسری دنیا کی اقوام پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ ان کی سیاسی معاشی اور سماجی فلاح اور آزادی اشتراکی نظام معاشرہ کے قیام ہی سے وابستہ ہے۔

اضلاع متحدہ کا سامراج یوں تو ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے پر تول رہا ہے لیکن لاطینی امریکہ کی ترقی پذیر اقوام خاص طور سے اس پیر تسمہ پا کی چیرہ دستیوں سے نالاں ہیں۔ جان گنتھر[1] لکھتا ہے کہ لاطینی ممالک کا مستقبل مکمل طور پر اضلاع متحدہ کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔ آج سے بیس برس پہلے کے اعداد و شمار کے مطابق اضلاع متحدہ امریکہ نے لاطینی امریکہ میں چار ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی جواب کھربوں تک پہنچ گئی ہے۔ ان اقوام کو اس بری طرح قرض کے بندھنوں میں جکڑ دیا گیا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں مارنے سے بھی معذور ہوگئی ہیں۔ ان کی معیشت پوری طرح اضلاع متحدہ کے تصرف میں ہے۔ کانوں پر ان کا قبضہ ہے۔ قلعی' تانبہ اور مٹی کے تیل کے ذخائر امریکی کمپنیوں کے ہاتھوں میں ہیں جنھیں اپنی حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ جہاں کہیں ان کے مالی مفادات کو خطرہ لاحق ہوتا ہے امریکی فوجی مشیر اور سی آئی اے کے گماشتے مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ اور "ناگوار عناصر" کا قلع قمع کر دیا جاتا ہے امریکہ کے درآمدی برآمدی بینک نے لاطینی امریکہ کی کرنسی کو اپنی مضبوط گرفت میں لے رکھا ہے۔ بعض لاطینی ممالک کو بنوک شمشیر قرضے لینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہیٹی کو مجبور کر کے اسے چار کروڑ ڈالر کا قرضہ دیا گیا تھا۔ کیوبا کی شکر سازی کی صنعت میں امریکہ نے ایک ارب بیس کروڑ ڈالر کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ اس کے استحصال سے نجات پانے کے لیے فیدل کاسترو اور اس کے ہم نوا اشتراکیوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور امریکی سرمائے کو ضبط کر لیا۔ امریکہ نے کیوبا کے بورژوا مہاجرین کو اپنے ساتھ ملا کر کئی بار کیوبا پر حملہ کرایا اور فیدل کاسترو کو نکالنے کے لیے باقاعدہ فوج کشی کا منصوبہ بنایا لیکن سوویت یونین مانع

1 Inside Latin America Jhon Gunthur

ہوئی۔ اس نے کیوبا سے ایٹمی اسلحہ ہٹانے کے بدلے امریکہ سے معاہدہ کیا کہ وہ کیوبا پر حملہ نہیں کرے گا۔ کیوبا کی مثال نے سارے لاطینی امریکہ میں انقلابی تحریکوں کو تقویت دی ہے اور چے گویرا جیسے حریت پسند امریکی سامراج کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اضلاع متحدہ کے مالی تسلط کا یہ عالم ہے کہ جب برازیل نے کافی کی قیمت بحال رکھنے کے لیے کافی کی فاضل پیداوار کے سات کروڑ تھیلے ضائع کرنے کا ارادہ کیا تو اس مقصد کے لیے اضلاع متحدہ امریکہ نے اسے چار کروڑ ڈالر کا قرضہ دیا۔ 1940ء تک اضلاع متحدہ ارجنٹائن کو ساٹھ کروڑ ڈالر کا قرض دے چکا تھا جو اب کئی اربوں تک پہنچ گیا ہے۔ اضلاع متحدہ نے سب سے زیادہ سرمایہ کاری چلی میں کر رکھی ہے۔ کیونکہ وہاں لوہے تانبے اور کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔ اس لیے جب الاندے کی کوششوں سے اشتراکی انقلاب کے لیے راہ ہموار ہو گئی تو امریکی سی آئی اے نے سازش کرا کے اسے قتل کرا دیا اور حکومت پر دوبارہ رجعت پسندوں کا قبضہ ہو گیا۔ بولیویا کے قلعی کے ذخائر امریکی صنعت کاروں کے قبضے میں ہیں۔ اضلاع متحدہ نے بولیویا کو چھ کروڑ ڈالر کا قرضہ اس وقت دیا جب ملک کا اپنا بجٹ کل بارہ کروڑ ڈالر تھا۔ اضلاع متحدہ نے لاطینی امریکہ کے ملکوں میں "تہذیبی ادارے" کھول دیئے ہیں جنہیں پیرو کے باشندے "چھٹا کالم" کہتے ہیں۔ پیرو کے مٹی کے تیل کی پیداوار کا اسی' تانبے کی پیداوار کا پچانوے' چاندی کا پچھتر' سونے کا پچاس فی صد امریکی اجارہ داروں کے ہاتھوں میں ہے۔ دنیا بھر کے سب سے زیادہ مٹی کا تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں وینزویلا کا تیسرا درجہ ہے جو اضلاع متحدہ کے تصرف میں ہے۔

کولمبیا میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ پلاٹینم نکالی جاتی ہے۔ جو اضلاع متحدہ کی تحویل میں ہے۔ کولمبیا والے اضلاع متحدہ سے سخت نالاں ہیں لیکن قرضوں کے جال میں جکڑے ہوئے پھڑ پھڑا کر رہ جاتے ہیں۔[1]

نئے نوآبادیاتی نظام کو قائم و دائم رکھنے کے لیے دنیا بھر کے بورژوا ممالک نے ایکا کر لیا ہے اور بین الاقوامی امدادی اداروں' بینکوں اور ایجنسیوں کے واسطے سے ترقی پذیر ملکوں کی لوٹ کھسوٹ میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تیسری دنیا کے خام مال اور سامان تجارت کی قیمتیں یہ بین الاقوامی ادارے مقرر کرتے ہیں

---

1. Inside Latin America

جو ترقی پذیر ممالک سے خام مال اونے پونے خرید لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ان ممالک میں بھاری فولادی صنعت کے قیام میں حائل ہوتے ہیں۔ مبادا وہ صنعتی لحاظ سے خودکفیل ہو جائیں۔ بورژوا ممالک میں دنیا بھر کی کل صنعتی پیداوار کا چالیس فی صد اضلاع متحدہ کے ہاتھوں میں ہے۔ امریکی ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے سامنے یورپ کے سرمایہ دار بھکاری لگتے ہیں۔ 1960ء میں راک فیلر ٹرسٹ کی دولت 97,300 ملین ڈالر' مارگن کی 95,900 ملین ڈالر' شکاگو کمپنی کی 31,300 ملین ڈالر' دوپاں کی 23,200 ملین ڈالر' بینک آف امریکہ کی 23,300 ملین ڈالر' میلنز کی 15,400 ملین ڈالر تھی۔ اضلاع متحدہ کی ایک فی صد آبادی کے پاس ملکی دولت کا ساٹھ فی صد حصہ ہے۔ جب کہ ستاسی فیصد آبادی کا اس دولت میں صرف 8 فی صد حصہ ہے۔ 1955ء میں 7.4 فی صد امریکی خاندانوں کی آمدنی 15.4 فی صد تھی۔ برطانیہ کی کل آبادی کا ایک فیصد حصہ ملک کی کل دولت کے پچاس فی صد پر قابض ہے۔ اس کے باوجود امریکہ اور برطانیہ کے دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہمارے یہاں شخصی املاک کا خاتمہ ہو رہا ہے اور غیر طبقاتی معاشرہ صورت پذیر ہو رہا ہے۔ سابق صدر نکسن نے تو یہاں تک دعویٰ کیا تھا کہ ریاستی اجارہ داری کے باعث اضلاع متحدہ میں طبقاتی آویزش ختم ہوگئی ہے اور اس کا معاشرہ غیر طبقاتی ہے۔

اضلاع متحدہ امریکہ کے اقتصادی اور سامراجی ہتھکنڈے اقوامِ عالم میں اشتراکیت کے نفوذ کو روکنے میں ناکام رہے تو اس ناکامی کے اسباب پر غور کرتے ہوئے بورژوا دانشوروں نے یہ انکشاف کیا کہ بورژوا ممالک کو ایٹمی ہتھیاروں سے زیادہ نظریاتی حربوں کی ضرورت ہے اور اشتراکی خیالات کے رواج وقبول کا اصل سبب یہ ہے کہ سوویت روس کا پروپیگنڈہ بہت زبردست ہے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھنے سے معذور ہیں کہ اشتراکی انقلاب کو نہیں بلکہ ردّ انقلاب کو برآمد کیا جاتا ہے۔ تیسری دنیا کی اقوام جانتی ہیں کہ اشتراکی انقلاب برپا کر کے معاشی آزادی حاصل کی جا سکتی ہے جو حقیقی آزادی ہوتی ہے۔ بہر حال بورژوا دانشوروں جان گابرائتھ' روسٹو' چیسٹر باؤلز اور ہنری کسنجر وغیرہ نے سامراج کی معذرت خواہی کے لیے ایک نیا نظریاتی محاذ قائم کر دیا۔ اور اس کوشش میں فلاحی مملکت' نیا صنعتی انقلاب' سرمایہ دارانہ انقلاب' مربوط ''معاشرہ'' سرمایہ داری کا ارتقاء اشتراکیت کی طرف' مساوی مواقع والی ریاست' ''سرمایہ داری اور اشتمالیت میں مطابقت'' جیسی خوش

آئندہ تراکیب وضع کی ہیں اور ان کے حوالے سے اپنے استحصال کا جواز پیش کر رہے ہیں۔
یہ دانشور ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام فرسودہ اور زوال پذیر نہیں ہوا بلکہ پوری شان سے ارتقاء پذیر ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ عوام کمپنیوں کے حصہ دار بنتے جا رہے ہیں جس سے سرمایہ دار اور مزدور دونوں متوسط طبقے میں بدل گئے ہیں۔ محنت کشوں اور صنعت کاروں میں معاشی مساوات پیدا ہوگئی ہے۔ کیونکہ محنت کش بورژوا کے منافع میں شریک ہوگئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کے اسی فیصد مزدوروں کے پاس کسی کمپنی کے کوئی حصص نہیں ہیں۔ حصص گنتی کے ان ٹریڈ یونین راہنماؤں کے پاس ہیں جو سرمایہ داروں کے گماشتے ہیں اور مزدوروں کو گمراہ کرنے کے عوض اپنے آقاؤں سے بھاری رقمیں رشوت میں وصول کر رہے ہیں۔ کمپنیوں پر بدستور پدم پتی بورژوا کا تصرف ہے۔ یہ چند حصے داران کی برابری کیسے کر سکتے ہیں۔ ''واحد متوسط طبقے کا شاخسانہ'' مزدوروں کو استحصال سے غافل کرنے کے لیے کھڑا کیا گیا ہے۔ سرمایہ دار کی بے پناہ دولت اور محنت کشوں کے افلاس کا تضاد بدستور موجود ہے۔

بورژوا دانشور ''فلاحی مملکت'' کے حق میں عجیب وغریب قسم کے دلائل دے رہے ہیں۔ ایک دلیل یہ ہے کہ پدم پتی دوپاں کی بیوی بھی وہی دودھ پیتی ہے جو عام عورت کو میسر ہے۔ وہی پھل کھاتی ہے جو غریب عورتیں کھاتی ہیں' سمندری سیرگاہ کے کنارے دھوپ کھانے کی جس کرسی پر دوپاں کی بیوی بیٹھتی ہے اسی پر عام کاریگروں کی بیویاں بیٹھتی ہیں' ارب پتی ہوں یا کلرک دونوں ٹی وی پر ایک ہی جیسا پروگرام دیکھتے ہیں۔ لہٰذا طبقاتی تفریق مٹ چکی ہے۔ مارکس کا نظریہ فرسودہ ہو چکا ہے۔ سرمائے کی صورت بدل گئی ہے۔
پھر الزامی دلیل دی جاتی ہے کہ سوویت روس کی اشتراکی ریاست بھی تو اب سرمایہ دار ریاست بن گئی ہے اور اشتراکیت کا ذکر محض دکھاوے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اڈلائی سٹیونسن نے کہا تھا کہ سوویت روس دولت مند ہونے کے ساتھ خود بخود سرمایہ دار ریاست بن جائے گی۔ یہ وہی نفسیاتی کیفیت جس کے تحت آدمی جس چیز کی خواہش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فرض بھی کر لیتا ہے کہ واقعی ایسا ہوگیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ:

1- بورژوا نظام میں پیداوار کا واحد مقصد نفع خوری ہے۔ جب کہ سوویت روس اور دوسرے اشتراکی ممالک میں یہ منافع سارے شہریوں پر تقسیم ہو جاتا ہے اور کسی

شخص کو ذاتی نفع خوری کی اجازت نہیں دی جاتی۔ نہ کسی شخص کے لیے منافع کمانا ممکن ہی ہے کیونکہ وسائل پیداوار افراد کے نہیں اجتماع کے تصرف میں ہیں۔

2- اشتراکی معاشرے میں شخصی املاک صرف ذاتی ضروریات تک محدود کر دی گئی ہیں۔

3- اشتراکی معاشرے میں پیداوار تقسیم اور صرف باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے کی جاتی ہے۔ جس میں چند اشخاص کے منافع کا نہیں بلکہ پورے معاشرے کی بہبود کا خیال رکھا جاتا ہے۔ سرمایہ دار ممالک میں اس نوع کی منصوبہ بندی ممکن نہیں ہو سکتی کیونکہ سرمایہ دار ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنی تجوری بھرنا چاہتا ہے۔

سوویت روس میں آج کل جو معاشی اصلاحات نافذ کی جا رہی ہیں اور جن کی جھلکیاں نئے آئین میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا مقصد عوامی فلاح ہے۔ وسائل پیداوار بدستور معاشرے کے قبضے میں ہیں۔ اس لیے ذاتی نفع خوری یا استحصال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ''عوامی سرمایہ'' کی بات کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ مثلاً 1965ء میں امریکی اجارہ داروں نے 45 ہزار ملین ڈالر کا نفع کمایا جبکہ تین کروڑ سے زائد امریکی افلاس کی زندگی گذار رہے تھے۔ حتیٰ کہ اس ''فلاحی ریاست'' میں 15 فی صد لوگ بیروزگاری اور معاشی بدحالی کا شکار ہیں۔ ایک امریکی لیون کیسرلنگ کے بقول کم و بیش آٹھ کروڑ امریکیوں کا معیار معیشت پست تر ہو گیا ہے۔ اضلاع متحدہ امریکہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد پندرہ سالوں میں چار مرتبہ شدید مالی بحرانوں میں مبتلا ہو چکا ہے یعنی 48-1947ء 54-1953ء، 1952ء اور 61-1960ء میں جس سے بیروزگاری میں اضافہ ہوا اور عوام کو گوناگوں مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ آج امریکی ڈالر کی ساکھ گر چکی ہے، دوسری طرف اشتراکی ممالک میں بیروزگاری، افراطِ زر اور گرانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مخلوط معاشرے کے حق میں کہا جا رہا ہے کہ اس میں سرمایہ داری نظام اور اشتراکیت ضم ہو کر ایک ہی معاشرے کے دو پہلو بن گئے ہیں۔ جن سے سرمایہ داری نظام کی خامیاں رفع ہو گئی ہیں اور اشتراکیت کے فضائل شامل ہو گئے ہیں اور یہ معاشرہ انقلاب سے نہیں ارتقائی عمل سے شکل پذیر ہوا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مخلوط معاشرے کے نام پر شخصی املاک کا تقدس برقرار رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس حقیقت سے صرف نظر کر لیا گیا ہے کہ شخصی املاک کا انسداد ہی اشتراکی معاشرے کا سنگ بنیاد ہے جو

معاشرہ شخصی املاک پر قائم ہوگا اس میں اشتراکی معاشرے کی برکات کیسے در آئیں گی۔

امریکی دانشوروں کا کہنا ہے کہ محنت کشوں اور کاریگروں کو کاریں' فریج وغیرہ مہیا کر دیئے جائیں تو وہ انقلابی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے۔ لیکن اصل مسئلہ تو پیداواری وسائل کا ہے جب تک یہ وسائل سرمایہ داروں کے قبضے میں رہیں گے محنت کشوں کا استحصال ہوتا رہے گا۔ اور ان کی محنت کی کمائی طفیل خوار صنعت کار سمیٹتے رہیں گے۔ محنت کش خواہ کتنے ہی آسودہ حال کیوں نہ ہو جائیں' یہ خلش انہیں سدا بے چین رکھے گی کہ محنت ہم کرتے ہیں اور اس کا ثمرہ سرمایہ داروں کی جیب میں جاتا ہے۔ جب تک یہ خلش موجود ہے انقلابی شعور بھی باقی رہے گا۔ بورژوا دانشور ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ اشتراکی نظام غیر فطری ہے کیونکہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ محنت پر آمادہ کرنے کے لیے مالی ترغیبات' شخصی املاک اور صنعتی وتجارتی مسابقت کا جذبہ ضروری ہے۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ سب سے قوی تحریک وتشویق[1] نظریاتی ہوتی ہے اور روس چین اور دوسرے اشتراکی ممالک کی حیرت انگیز ترقی کا راز اسی تحریک وتشویق میں مخفی ہے۔

دانشوروں کے محولا بالا خیالات ان کے نظام معاشرہ ہی کا عکس ہیں۔ وہ شخصی املاک کو بحال رکھنے کے لیے جہاں اس کے حق میں دلائل دیتے ہیں وہاں اشتراکی معاشرے پر آئے دن تعریضات بھی کرتے رہتے ہیں جو قدرتاً ان کے تعصبات کی غمازی کرتے ہیں۔ اشتراکی نظام پر جو اعتراض شدومد سے کیا جا رہا ہے' وہ یہ ہے کہ اشتراکی ممالک میں فرد کی آزادی سلب کر لی گئی ہے اور اس سے جبری بیگار لی جا رہی ہے۔ جب کہ سرمایہ دار ممالک کے شہریوں کو کامل آزادی میسر ہے اور وہ جو بھی چاہے کر سکتے ہیں۔ یہ اعتراض حقائق کے منافی ہے۔ مارکسی نظریئے کی رو سے معاصر اشتراکی ریاست عبوری مرحلے سے گذر رہی ہے۔ اس عبوری مرحلے میں سامراجیوں کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ریاست کو بحال رکھنا ضروری ہے۔ اگر انارکسٹوں کے خیال کے مطابق انقلاب کے بعد ریاست ختم کر دی جاتی تو سوویت روس رڈ انقلاب اور خانہ جنگی کے باعث تباہ ہو جاتی۔ جب تک ریاست موجود ہے اس کے تحفظ و بقاء کی خاطر افراد کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

---

1 Ideological Motivation

ریاست اور جبر لازم و ملزوم ہیں۔ زرعی انقلاب کے بعد ریاست وجود میں آئی تو شہری اپنے بعض انفرادی حقوق سے جن میں من مانی کرنے کی آزادی بھی تھی۔ دست بردار ہو گئے! زیادہ صحیح الفاظ میں حکام نے ان کی یہ آزادی سلب کر لی تاکہ اپنے اقتدار اور ریاست کی بقاء کے لیے وہ شہریوں کے فکر و عمل پر پابندیاں عائد کر سکیں۔ چنانچہ صبح تاریخ سے ریاست خواہ وہ ملوکی رہی ہو یا مذہبی جمہوری رہی ہو یا اشرافیہ' آمرانہ رہی ہو یا اشتراکی اپنے تحفظ کے لیے انفرادی قدر و اختیار کو سلب کرتی رہی ہے اور آج بھی کر رہی ہے چنانچہ جبر و تشدد آہنی پردے ہی کے پیچھے نہیں بلکہ نام نہاد "آزاد دنیا" کے سنہرے پردے کے پیچھے بھی اپنی تمام تر قاہری اور سنگینی کے ساتھ موجود ہے۔ آزاد دنیا کے سب سے بڑے محافظ اور "فرد کی آزادی" کے سب سے بڑے حامی اضلاع متحدہ امریکہ میں عرصہ دراز سے میکارتھی مت اور جادوگرنیوں کے شکار کا سلسلہ دراز ہو رہا ہے۔ سی آئی اے اور ایف بی آئی کی تنظیموں نے اکثر قابل اعتناء شہریوں کی فائل کھول رکھی ہے۔ جس میں ان کی نجی زندگی ان کے معاشقوں اور کاروباری ریشہ دوانیوں کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ جس کی بنا پر ضرورت پڑنے پر انہیں ڈرا دھمکا کر "راہ راست" پر لایا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں قاتلوں اور ٹھگوں کی رسوائے عالم تنظیم مافیا کے دو پیشہ ور قاتلوں سام گن چی آنا اور جان روز یلی نے امریکی سینٹ کے سامنے یہ انکشاف کیا کہ سی آئی اے نے انہیں فیدل کاسترو کے قتل پر مامور کیا تھا۔ اس بیان کے چند روز بعد انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ سی آئی اے اور ایف بی آئی نے ریاست کے اندر اپنی خود مختار ریاستیں قائم کر رکھی ہیں۔ ایف بی آئی کے ایک افسر ایڈورڈ ٹلی نے گذشتہ دنوں ایک بیان میں دانشوروں' صحافیوں اور قانون دانوں کو متنبہ کیا اور کہا کہ یہ نام نہاد پڑھے لکھے لوگ اپنے اوٹ پٹانگ خیالات کا اظہار کر کے ریاست کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سائبیریا روس کو تو زار شاہی سے ملا تھا۔ اضلاع متحدہ نے اپنا زیادہ خوفناک سائبیریا بنا رکھا ہے۔ سوویت یونین سولوے نیٹسن جیسے رجعت پسند پر گرفت کرے تو فرد کی آزادیٔ اظہار کے نام پر مغربی ممالک میں ہاہا کار مچ جاتی ہے اور وسیع ذرائع ابلاغ سے کام لے کر چاروں طرف اشتراکیوں کے جبر و تشدد کا چرچا کیا جاتا ہے۔ خود اضلاع متحدہ کا یہ حال ہے کہ میکاران ایکٹ مجریہ 1950ء کی رو سے امریکی اشتراکیوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے

نام غیر ملکی ایجنٹوں کے بطور درج کرائیں۔ نہ کرانے کی صورت میں انہیں پانچ برس قید کی سزا دی جاتی ہے اور دس ہزار ڈالر روزانہ کے حساب سے جرمانہ کیا جاتا ہے۔

حد یہ ہے کہ ایک دن ایک امریکی ہوٹل میں بیٹھا جیفرسن کا لکھا ہوا منشور حقوق پڑھ رہا تھا۔ پولیس والے اسے تخریبی سرگرمیوں کے الزام میں پکڑ کر لے گئے۔ اضلاع متحدہ امریکہ میں جان برچ فاشستی تنظیم کی ایک لاکھ شاخیں ملک بھر میں کام کر رہی ہیں جن کے اپنے چھاپہ خانے ہیں۔ جہاں ہر سال پروپیگنڈہ کی ہزاروں کتابیں چھپتی ہیں۔ اس تنظیم کو پدم پتی صنعت کار مارگن کی طرف سے کروڑوں ڈالر سالانہ کی امداد دی جاتی ہے۔ تنظیم کے جریدے امریکن اوپی نین کا اپنا سرمایہ پچاس ملین ڈالر ہے۔ اس تنظیم کے ایک لیڈر رابرٹ ویلچ نے اعلانیہ کہا کہ جمہوریت محض ڈھونگ ہے' مذاق ہے میں برسر اقتدار آ گیا تو ملک کو قیدیوں کی باڑوں اور گیس خانوں سے بھر دوں گا۔ جہاں اشتراکیوں' جمہوریت پسندوں اور حبشیوں کو جلا کر بھسم کر دیا جائے گا۔ اضلاع متحدہ کی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کو ہر طریقے سے ہراساں کیا جاتا ہے۔ خفیہ پولیس کے آدمی ان کے پیچھے سائے کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں۔ ان کا جینا حرام کر دیا گیا ہے۔ کوکلکس کلاں والوں نے حبشیوں پر ناطقہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔

1965ء میں غربت کے مارے ہوئے بیروگار اور مظلوم حبشیوں نے مختلف شہروں میں احتجاجی جلوس نکالے اور تقریریں کیں کہ آخر کیوں ہمیں ابتدائی انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے؟ کیوں ہمیں حیوانات سے بدتر سمجھا جاتا ہے؟ لاس اینجلس میں حبشیوں کے جلوس پر فوجیوں اور پولیس والوں نے اندھا دھند گولیاں برسائیں اور سینکڑوں بے گناہوں کو خاک و خون میں ملا دیا۔ ان کے مکانوں کو آگ لگا دی گئی اور ان کے مکانوں کو لوٹ لیا گیا۔ اس پر سوویت روس کے سائنسدانوں' دانشوروں' ادیبوں اور فنکاروں نے اضلاع متحدہ کے صدر کو کھلا خط لکھا جس میں کہا:

> ''اس معاشرے کی پستی کا اندازہ لگانے کا معیار کیا ہوگا جہاں انتظامیہ فوج اور پولیس ایسے غیر انسانی مظالم روا رکھتی ہے۔ یہ کس قسم کا معاشرہ ہے جہاں لوگ مایوسی کے عالم میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور دن دیہاڑے تمام دنیا کے سامنے انہیں مشین گنوں سے موت کے گھاٹ اتار

دیا جاتا ہے۔ ہم سن چکے ہیں کہ لاس اینجلس کے نمونے پر سنیجا ڈومنگو کے
درودیوار کو ٹینکوں سے زمین بوس کر دیا گیا۔ جن کے شعلوں نے حبشیوں کی
بستیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان سے ویت نام کے سلگتے ہوئے
دیہات کی یاد تازہ ہوگئی۔

جنابِ صدر! بنی نوع انسان کو آپ سے یہ سوال پوچھنے کا حق
حاصل ہے۔ کیا آزادی کی تصویر وہی ہے جو لاس اینجلس میں بموں اور
سنگینوں سے مظلوموں پر ٹھونسی جا رہی ہے کیا یہی "انسانی حقوق کا احترام"
ہے جس کا ڈھنڈورا اضلاع متحدہ کے ترجمان آئے دن پیٹتے رہتے ہیں اور
جن کی رٹ امریکی مندوب اقوامِ متحدہ کے اجلاسوں میں بڑی فصاحت و
بلاغت سے لگاتے رہتے ہیں۔"

ان حقائق کے باوجود سوویت روس کے بارے میں متواتر و تسلسل سے یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ وہاں فرد کو آزادی سے محروم کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی ممالک میں بلاتفریق رنگ و نسل، مذہب و مسلک، زبان و تہذیب تمام شہریوں کو کام، علاج، تعلیم، خوراک، ٹھکانے اور تفریح کی یکساں آسائشیں اور سہولتیں میسر ہیں۔ بچوں کو بہترین تعلیم دلائی جاتی ہے اور طلبہ و طالبات کی ذاتی صلاحیتوں کے پیش نظر ان کے لیے نصاب تعلیم تجویز کیا جاتا ہے۔ پورے ملک میں ایک شخص بھی بیکار و بے روزگار نہیں ملتا۔ اضلاع متحدہ میں لاکھوں بے روزگار سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں۔ جن کے باعث سنگین جرائم روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ دن دیہاڑے راستہ چلتے پسلیوں میں پستول کا ٹہوکا دے کر شہریوں کو لوٹ لیا جاتا ہے اور مزاحمت کرنے والوں کو بے دریغ گولی مار دی جاتی ہے۔ زرطلبی کے جنون نے بے شمار لوگوں کو نفسیاتی امراض میں مبتلا کر دیا ہے۔ منشیات اور جنسی کجرویوں نے اخلاق و کردار کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ سب "انفرادی آزادی" ہی کی کرشمہ کاری ہے جسے بے راہ روی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اشتراکی ممالک میں بے شک اس نوع کی بے راہ روی کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اشتراکی ممالک میں افراد کو غصب و استحصال کی آزادی، دوسروں کے مفادات کو شخصی مفاد کے نام پر کچلنے کی آزادی دوسروں کو بیروزگار رکھ کر بھوکوں مارنے کی آزادی میسر نہیں ہے۔ البتہ جہالت، امراض، اوہام، غیر محفوظ

بڑھاپے، عدم تحفظ کے احساس، قحبی گداگری، پروہتوں کی ابلہ فریبی، امراء کی طفیلی خواری کا خاتمہ کر کے عوام کو ان بندھنوں سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ جن کے باعث وہ ہزاروں برسوں سے دل کی خوشی اور ذہن کی آسودگی سے محروم چلے آ رہے تھے۔

جہاں تک ترقی پذیر اقوام کا تعلق ہے وہ اپنے یہاں اشتمالی معاشرہ قائم کر کے ہی جہالت، غربت، طفیل خوار سرمایہ داروں اور زمینداروں کے جبر و استحصال سے نجات پا سکتی ہیں۔ سرمایہ داری کی راہ پر چل کر اس خلیج کو پاٹنا ممکن نہیں ہے جو ترقی یافتہ اقوام اور پس ماندہ ممالک کے درمیان گذشتہ دو سو برسوں سے وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ ان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ فولاد کی بھاری صنعت قائم کر کے اور اجتماعی کھیتی باڑی کو رواج دے کر اہل مغرب کی تکنیکی غلامی سے نجات پا لیں۔ اس ضمن میں اشتراکی ممالک کی روز افزوں ترقی ان کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ ہم یہاں سوویت روس کی ایک ریاست کی مثال دیں گے۔ جس کی کایا اشتراکی انقلاب نے چند ہی سالوں میں پلٹ کر رکھ دی ہے۔

ازبکستان 1918ء سے پہلے دنیا کے پس ماندہ ترین علاقوں میں شمار ہوتا تھا۔ چاروں طرف میلوں تک گھاس کے میدان پھیلتے چلے گئے تھے۔ ازبک گھوڑے اور بھیڑ بکریاں پال کر گزر بسر کرتے تھے۔ وہ کھالوں کے بنے ہوئے خیموں میں جاڑے کی کڑیاں جھیلتے اور نیچر کے رحم و کرم پر نیم فاقہ کشی کی زندگی گذارتے تھے۔ طبی امداد اور تعلیم و تربیت کے برکات سے محروم تھے۔ انہیں خواب میں بھی سائنس کی ایجادات یا صنعتی انقلاب کا خیال نہیں آیا ہوگا۔ اتھاہ جہالت اور فکری جمود نے انہیں اوہام و خرافات میں مبتلا کر رکھا تھا۔ بخارا، سمرقند، خیوا وغیرہ کے شہروں میں خوانین کی آمرانہ حکومت تھی۔ جس کی روایات انہیں چنگیزی دور سے ملی تھیں۔ خوانین نے مخالفین کے لیے تہہ خانے بنوا رکھے تھے۔ جن میں سانپ اور بچھو پالے جاتے تھے۔ جس خوش شکل عورت پر کسی خان کی نظر تحسین و شوق پڑ جاتی اسے بے تکلف حرم میں داخل کر لیا جاتا تھا۔ 1918ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد چند ہی سالوں میں جمہوریہ ازبکستان معاشی، سائنسی اور معاشرتی پہلوؤں سے گلہ بانی کے دور سے نکل کر بیسویں صدی تک پہنچ گئی۔ ذیل میں اس کی چند جھلکیاں ہی دکھائی جا سکیں گی۔

جمہوریہ ازبکستان میں ساٹھ قومیتیں آباد ہیں۔ جن میں اکثریت ازبکوں کی ہے۔ یہ جمہوریہ دریائے آمو اور دریائے سیر کے درمیانی علاقے میں واقع ہے اور اس کی کل آبادی ایک کروڑ دس لاکھ ہے۔ اس جمہوریہ میں سو سے زیادہ اجتماعی کھیت ہیں جو 37 لاکھ ایکڑ اراضی پر مشتمل ہیں۔ ان کھیتوں میں جن میں بعض کئی کئی میلوں تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ مشینوں سے کاشت کاری کی جاتی ہے۔ پوری جمہوریہ میں نہروں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ اور پچھتر لاکھ ایکڑ اراضی میں آب پاشی کی جاتی ہے۔ جو سوویت روس کے کل آبپاشی کے علاقے کا 40 فیصد رقبہ بنتا ہے۔ ازبکستان میں سوویت روس کی کپاس کی کل پیداوار کا دو تہائی حصہ اگایا جاتا ہے۔ پچھتر مختلف قسموں کی کپاس کاشت کی جاتی ہے۔ ایک لاکھ کے قریب ٹریکٹر کھیتوں میں کام کر رہے ہیں اور پھٹی چننے کے لیے 25 ہزار کلیں موجود ہیں۔ سینکڑوں باغات میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں عمدہ قسم کے انگور' سیب' ناشپاتی' انار' تربوز' انجیر وغیرہ اگائے جاتے ہیں۔ یہاں کا انگور اپنے ذائقے اور خوشبو کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ انجیر کی بیالیس قسمیں ہیں جن میں کرشی کی انجیر بہترین سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کے تربوز نہایت رسیلے اور خوش ذائقہ ہیں۔ قراقلی (لغوی معنی سیاہ جھیلی) حاصل کرنے کے لیے عمدہ نسل کی لاکھوں بھیڑیں پالی جاتی ہیں۔ سوویت روس کے کل ریشم کا نصف حصہ ازبکستان ہی سے حاصل کیا جاتا ہے۔

ازبکستان میں اضلاع متحدہ اور چین کے بعد دنیا بھر میں سب سے کثیر مقدار میں کپاس پیدا ہوتی ہے۔ جس کے باعث یہاں سوت کاتنے اور کپڑا بننے کے بڑے بڑے کارخانے کام کر رہے ہیں۔ جو محنت کشوں کی مشترکہ املاک ہے۔ اس جمہوریہ میں فرانس اور اطالیہ سے زیادہ بجلی پیدا کی جاتی ہے اور بجلی کی کلیں بنانے' انجینئرنگ' کیمسٹری' فولاد سازی اور تیل صاف کرنے کے وسیع کارخانے قائم کیے گئے ہیں۔ کپاس بیلنے اور کپڑا بننے کی صنعتوں کے بعد سوویت روس میں ریشمی کپڑا بننے اور بناسپتی گھی بنانے کی صنائع میں ازبکستان کا درجہ تیسرا ہے۔ صرف تاشقند میں تین سو بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ فرغانہ کی وادی میں تیل نکالنے اور صاف کرنے' فریج اور ایئر کنڈیشننگ کا سامان تیار کرنے کے کارخانے کام کر رہے ہیں۔ فرغانہ ہی میں سوویت روس کا سب سے بڑا ریشم سازی کا کارخانہ قائم کیا گیا ہے۔

ازبکستان میں اٹھارہ ہزار چوٹی کے سائنسدان ایٹمی کارخانوں اور کمپیوٹروں کے اداروں میں تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ سائنس کی تعلیم کے لیے اعلیٰ درجے کے ادارے موجود ہیں۔ طبی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے جا بجا شفا خانے کھول دیے گئے ہیں۔

جمہوریہ ازبکستان میں ریلوں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ تاشقند سب سے بڑا ریلوے جنکشن ہے۔ جمہوریہ کو ہوائی جہازوں سے ملک کے بڑے بڑے شہروں سے ملا دیا گیا ہے۔ ازبکستان سے قراقلی کپاس، سوت، کپڑا، ٹریکٹر، کپاس سے متعلقہ صنائع کی کلیں، ڈیزل انجن تیل نکالنے کی کلیں برآمد کی جاتی ہیں۔ یہاں کی مصنوعات برطانیہ، فرانس، اطالیہ، سویڈن، مغربی جرمنی اور آسٹریا کو برآمد کی جاتی ہیں۔ 1913ء میں پورے ازبکستان میں ایک سو دو ڈاکٹر اور اسی دوا ساز تھے۔ آج کل ڈاکٹروں کی تعداد اٹھارہ ہزار سے زائد ہے جو مختلف امراض میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔ یہاں کی طبی درسگاہوں سے ہر سال ہزاروں ڈاکٹر فارغ التحصیل ہو کر ملک بھر میں طبی خدمات انجام دیتے ہیں۔

ازبکستان میں ہزاروں کتابیں ہر سال مختلف تحقیقی علوم پر شائع ہوتی ہیں۔ علی شیر نوائی مرکزی کتب خانے میں تیس (30) لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ ایک ہزار بہتر اخبارات و جرائد ازبک، روسی، تاجیک، قزاقی، تاتاری وغیرہ زبانوں میں شائع کیے جاتے ہیں۔ ہر صنعتی ادارے اور کھیت کے ساتھ سینما گھر، بیلے ناچ گھر، سرکس اور تھیٹر وابستہ ہیں۔ جہاں تفریح اور ورزش کی سہولتیں میسر ہیں۔ حمزہ ازبک تھیٹر سب سے بڑا ہے۔ ناٹک گھروں میں ازبکوں کی قومی تہذیب، لوک گیتوں، لوک ناچوں اور لوک کلا کو پیش کیا جاتا ہے۔ کلاسیکی موسیقی اور لوگ سنگیت کو فروغ دینے کے لیے اٹھارہ ادارے ہیں جن کی اپنی اپنی سنگیت منڈلیاں ہیں۔ قدیم فنون اور صناع کو بھی ترقی دی جا رہی ہے۔ گلی برتن بنانے، کوفت گری، کشیدہ کاری اور قالین بافی کے بڑے بڑے مراکز ہیں۔ ازبکستان کے شہریوں کے لیے پانچ لاکھ ٹی وی سیٹ تفریح کا سامان پیش کر رہے ہیں جن کے پروگرام روسی اور ازبکی زبانوں میں دکھائے جاتے ہیں۔ تاشقند ریڈیو سٹیشن سے انگریزی، اردو اور ہندی میں خبریں نشر کی جاتی ہیں۔ ہزاروں خواتین اعلیٰ تعلیم اور مہارت خصوصی کی سند یافتہ ہیں۔ ان میں ڈاکٹر، انجینئر، تکنیکی ماہرین، استاد جوہری سائنسدان، ٹریکٹر ڈرائیور اور پائلٹ شامل ہیں۔ پوری ریاست میں ایک عورت بھی ان پڑھ نہیں ہے۔ سترہ ہزار عورتیں انجینئر اور تکنیکی

ماہر ہیں۔ بیالیس پی. ایچ. ڈی ہیں۔ ایک ہزار کے پاس ماسٹر آف سائنس کی ڈگری ہے۔ سات ہزار سے زیادہ عورتیں اعلیٰ تحقیقی کام کر رہی ہیں۔ ان میں زلفیہ' امیدووا' عالیہ اسمٰعیلووا' مقصودہ راضی فووا' مرحمت یلدہ شیوا' ترسونوئی آخونووا' صوفیہ کرمانووا سائنس ٹکنیک' طب اور فن و ادب میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔

ازبکستان کی حیرت انگیز ترقی کی اس درخشاں مثال سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ازبکوں کا گلہ بانی کا معاشرہ انقلاب کی برکت سے جدید ترین صنعتی معاشرے میں بدل گیا ہے اور ازبکوں نے ہزاروں برسوں کا تہذیبی و علمی سفر پچاس ساٹھ برسوں میں ہی طے کر لیا ہے۔ اس مثال سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ کی ترقی پذیر اقوام بھی اپنے یہاں اشترا کی نظام معاشرہ قائم کر کے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکتی ہیں اور اپنی معاشی' سماجی اور علمی مشکلات پر قابو پا سکتی ہیں۔

سید علی عباس جلالپوری کی فکری کتابیں

مقالات جلالپوری

رسوم اقوام

خرد نامہ جلالپوری

جنسیاتی مطالعے

عام فکری مغالطے

تاریخ کا نیا موڑ

روایات تمدن قدیم

روح عصر

کائنات اور انسان

اقبال کا علم کلام

مقامات وارث شاہ

روایات فلسفہ

وحدت الوجود تے پنجابی شاعری

سبدِ گلچین

6۔ بیگم روڈ، لاہور فون 042-37238014

Email: takhleeqat@yahoo.com www.takhleeqatbooks.com